جلد ۷۳
عدد ۱

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

مارچ ۱۹۷۰ء

ترجمان القرآن، لاہور

فہرست مضامین

جلد ۷۳ | مارچ ۱۹۷۰ء مطابق ذی الحجہ ۱۳۸۹ھ | عدد ۱

مغربی پاکستان — چندہ سالانہ سات روپے — فی پرچہ ۷۵ پیسے

ماہنامہ ترجمان القرآن

۵-اے ذیلدار پارک۔ اچھرہ۔ لاہور

مشرقی پاکستان — (بذریعہ ہوائی ڈاک) — سالانہ : ۵۰-۸ فی پرچہ ۸۵ پیسے

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس لاہور میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن، اچھرہ سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

جماعت اسلامی پاکستان بلکہ پوری دنیائے اسلام حال ہی میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے جس سچے غلام کی خدمات سے محروم ہوئی ہے، اس کی زندگی ملت کی بیش قیمت متاع تھی۔ اس کی وفات سے دینی حلقوں میں ایک ایسا خلا پیدا ہوا ہے جس کے پُر ہونے کی بظاہر کوئی صورت نظر نہیں آتی الا یہ کہ خالقِ حقیقی اسے اپنے خاص فضل سے پُر کر دے۔ چوہدری غلام محمد صاحب کوئی بہت بڑے عالم، کوئی شعلہ بیان مقرر، کوئی عظیم ادیب نہ تھے۔ پھر دنیوی مال و متاع اور مرتبہ کے اعتبار سے بھی وہ کسی ایسے بلند مقام پر فائز نہ تھے کہ وہ اہلِ دنیا کی توجہ کا مرکز بنتے۔ مگر اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے انہیں اسلام کے ساتھ سچی وابستگی اور اس کی سربلندی کے لیے گہری لگن عطا کی تھی جس کے باعث نہ صرف جماعت اسلامی میں بلکہ جماعت سے باہر کے حلقوں میں بھی ان کو بے حد مقبولیت حاصل تھی۔ جو شخص بھی ان سے متعارف ہوا وہ ان کی پُرکشش شخصیت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اور جو فرد بھی جتنا ان کے قریب آیا وہ اسی قدر ان کا گرویدہ ہو گیا۔ چوہدری صاحب مرحوم فی الحقیقت ایک سعیِ مجسم تھے۔ وہ جب تحریکِ اسلامی سے وابستہ ہوئے، اس وقت سے لے کر زندگی کے آخری سانس تک اسلام کی خدمت اور سربلندی کے لیے ہمہ تن مصروف رہے۔ اس مقدس کام میں ان کا انہماک اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ دنیا کا ہر دوسرا کام ان کی نظر میں بالکل بے وزن، غیر اہم بلکہ ہیچ ہو کر رہ گیا تھا۔ انہوں نے دل و دماغ کی ساری قوتیں بلکہ جسم و جان کی ساری توانائیاں پوری یکسوئی، اخلاص اور تدبر کے ساتھ خدا کی راہ میں صرف کیں اور اس معاملے میں کوئی ڈر یا خوف، کوئی دنیوی لالچ یا ترغیب و تحریص، کوئی مالی پریشانی یا گھریلو الجھن حتیٰ کہ ان کی ہر آن گرتی ہوئی صحت بھی ان کی راہ نہ روک سکی۔ انہوں نے اپنے عمل سے یہ ثابت کر دیا کہ انسان اپنی زندگی کا

مالک نہیں بلکہ امین ہے اور اسے ایک دیانتدار امین کی طرح اس کو خدا کی راہ میں صرف کرنا چاہیے۔ خدا کا یہ وفادار بندہ عرصہ دراز سے بیماری کے نرغے میں تھا، مگر اس نے کبھی اس کی پروا نہ کی۔ اس میں جب تک سکت رہی وہ ملک کے اندر، باہر اسلام کی سربلندی کے لیے مسلسل گھومتا پھرتا رہا۔ جماعت کے حلقہ کراچی کو اس نے اپنے تدبّر، حسن انتظام اور خلوص سے سرگرم عمل کیا۔ بیرونی ممالک میں متعدد مقامات پر تبلیغی مراکز قائم کیے۔ عربوں کو ان کی دینی ذمہ داریوں کا احساس دلایا۔ یورپ میں آباد مسلمانوں کو مغربی تہذیب کے مُضر اثرات سے بچانے اور ان کی اولاد کی دینی تعلیم و تربیت کے لیے مختلف منصوبے تیار کیے۔ دنیا کے جس خطّے میں بھی مسلمان مظلومیت کی زندگی بسر کر رہے ہیں مثلاً کشمیر، فلسطین، اریٹیریا اور افریقہ کی مسلم ریاستیں، ان کے مسائل اور ان کی حالتِ زار سے دنیا کو آگاہ کیا اور انسانیت کے ضمیر کو جھنجھوڑنے کی کوشش کی۔

بیماری نے جب چوہدری صاحب سے چلنے پھرنے کی سکت بالکل سلب کر لی تو بستر پر لیٹے لیٹے بھی وہ اس مقدس مشن کی تکمیل کے لیے کوشاں رہے۔ ان کی صحت کو دیکھتے ہوئے یہ احساس ہو رہا تھا کہ وہ شاید زیادہ دیر ہمارے درمیان نہ رہیں مگر ان کے بلند عزائم، ان کی جماعتی اور دینی سرگرمیوں، بیماری کی تکالیف سے بے پروائی اور موت سے بے خوفی کو دیکھ کر ہمارے سارے خدشات دُور ہو جاتے تھے۔ جس ولولے اور شوق کے ساتھ وہ اپنے خالقِ حقیقی سے ملے اس کے تصور سے اُس بہادر اور نڈر مسلمان سپاہی کا تصور سامنے آجاتا ہے جو شوقِ شہادت میں کفر کی یلغار کا بڑی پامردی سے مقابلہ کر رہا ہو، پھر اس کے اعضاء ایک ایک کر کے کٹنے لگیں تو وہ باقی ماندہ اعضاء سے ہی دشمن کے مقابلے میں برسرِ پیکار رہے اور جب اس کی زبان اور دوسرے اعضاء بھی کاٹ دیے جائیں تو وہ آخری وقت میں انگشتِ شہادت کو اٹھا کر خدا کی توحید اور محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کی رسالت کی شہادت دے اور زبانِ حال سے خلقِ خدا کو کہے، گواہ رہو، مَیں نے اپنا فرض حتی المقدور ادا کرنے کی کوشش کی، اب اس کام کی تکمیل تمہارے ذمّے ہے۔

اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلَہٗ وَارْحَمْہُ وَعَافِہٖ وَاعْفُ عَنْہُ وَاَکْرِمْ نُزُلَہٗ وَوَسِّعْ مُدْخَلَہٗ وَاَدْخِلْہُ الْجَنَّۃَ وَاَعِذْہُ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ وَمِنْ عَذَابِ النَّارِ۔

دنیا کی ہر تحریک اپنے علمبرداروں کے اندر ایک خاص طرز کا مزاج پیدا کرتی ہے۔ اسلام نے انسانوں کے اندر جو مزاج پیدا کیا ہے، تحمّل و بردباری، خدا ترسی و احساسِ ذمّہ داری، حق و انصاف کی حمایت، امن پسندی، عفت و پاکدامنی اور انسانی جان اور عزت و آبرو کا احترام اس کے طبعی خواص ہیں۔ اس کے مقابلے میں لادینی تحریکات، سرمایہ داری، اشتراکیت اور جارحانہ قوم پرستی نے لوگوں کے ذہنوں کو ہمیشہ لوٹ کھسوٹ، تشدد اور سازش کے لیے تیار کیا ہے۔ ان لادینی نظریات کے بڑھنے اور پھلنے پھولنے کی وجہ سے پورا ملک بڑی سرعت کے ساتھ تشدّد کی لپیٹ میں آ رہا ہے اور عوام خصوصاً نوجوان اس نہج پر سوچنے لگے ہیں کہ دنیا کا کوئی مسئلہ معقولیت، شائستگی اور افہام و تفہیم سے حل نہیں ہو سکتا، اسے حل کرنے کے لیے لازمی طور پر اندھی بہری قوت کا استعمال ہی ضروری ہے۔ یہ اندازِ فکر انسانی نقطۂ نظر سے جس قدر تباہ کن ہے اس کے تصور سے روح کانپ اٹھتی ہے۔ انسان کا اجتماعی بقا خود اس بات کی شہادت فراہم کرتا ہے کہ نسلِ انسانی کو بنیادی طور پر جن صفات سے متصف کیا گیا ہے ان میں محبت، باہمی تعاون، رحمدلی، امن پسندی اور ایک دوسرے کے لیے جذبۂ اخوت و خیر خواہی سب سے اہم صفات ہیں۔ اگر انسان ان صفات سے محروم ہو جائے تو اس کے لیے کسی معاشرے کے اندر رہنا بالکل ناممکن ہو جاتا ہے۔ جو لوگ آج تشدّد کے ذریعے ملک کے امن کو غارت کر کے اس کے مستقبل کا فیصلہ کرنا چاہتے ہیں انہیں یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ وہ تشدد کی جس آگ کو بھڑکا کر اپنے مخالفین کو نقصان پہنچانا چاہتے ہیں اس کے شعلوں کی لپیٹ سے وہ خود بھی کسی طرح بچ نہ سکیں گے۔ جس انسان کو ایک مرتبہ انسانی خون کی چاٹ پڑ جائے وہ اسے مشکل ہی سے چھوڑ سکتا ہے اور اگر اسے چاٹنے کے لیے دشمن کا خون نہ ملے تو پھر وہ دوستوں کے خون سے لذّت حاصل کرتا ہے۔ تاریخ کے بے شمار اوراق اس قسم کے عاقبت نااندیش رہنماؤں کے واقعات سے بھرے پڑے ہیں جنہوں نے اپنے مخالفین کو نیچا دکھانے کے لیے انسانوں کے ایک طبقے کے اندر تشدّد کے رجحانات کو ابھارا مگر بالآخر وہ خود بھی اسی جنون کا شکار ہوئے۔

جو لوگ تشدّد کو ہر دکھ کی دوا اور فتح و کامرانی کا مؤثر ہتھیار سمجھتے ہیں انہیں آگ لگانے سے پیشتر اس کے انجام پر پوری طرح غور کر لینا چاہیے اور اس امر کا اچھی طرح جائزہ لے لینا چاہیے کہ کیا وہ اس کے

ذریعے اپنے کسی تعمیری منصوبے کی تکمیل کر سکیں گے ؟ محض آگ لگا دینا اور انسانوں کو انسانوں سے لڑا دینا تو کوئی مفید کام نہیں ہے۔ انسان کو کسی ضابطۂ اخلاق کا پابند بنانا بڑا جان جوکھوں کا کام ہے اور اس کے لیے بڑی لمبی صبر آزما محنت اور تربیت کی ضرورت ہوتی ہے، مگر اس کے جذبات کو مشتعل کر کے اسے درندوں کی سطح پر لے آنا کوئی مشکل کام نہیں۔ سوچنا یہ چاہیے کہ جب انسان درندہ بن جائے تو اس سے کسی انسانی معاشرے کی تعمیر میں آخر کیا خدمت لی جا سکتی ہے ؟"

اسلام نے انسانیت پر جو بے شمار احسانات کیے ہیں ان میں ایک احسان یہ بھی ہے کہ اس نے انسان کے اندر علاقائی تعصبات، نسلی اور لسانی امتیازات اور رنگ اور وطن کے اختلافات مٹا کر عقیدے کی بنیاد پر انسان اور انسان کے مابین اخوت کا رشتہ استوار کیا۔ پاکستان کا وجود اسلام کے اس معجزانہ کارنامے کی شہادت فراہم کرتا ہے۔ مختلف نسلوں سے تعلق رکھنے والوں، مختلف بولیاں بولنے والوں اور مختلف علاقوں کے رہنے والوں نے رنگ، نسل اور زبان کے اختلافات کو یکسر نظر انداز کر کے اور علاقائی مفادات کو ٹھکرا کر یہ دعویٰ کیا کہ وہ توحید و رسالت کے اقرار کی بنا پر ایک ملت ہیں اس لیے انہیں ایک الگ خطۂ ارضی ملنا چاہیے جہاں وہ اسلام کے مطابق اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی تشکیل کر سکیں۔ اسی کے نتیجے میں یہ مملکت وجود میں آئی۔ اب جو شخص علاقائی تعصبات کو اُبھارتا اور پاکستان کے وسیع تر مفادات کے بجائے کسی مخصوص علاقے کے مفادات کی آڑ میں اختلافات کو ہوا دیتا ہے وہ درحقیقت پاکستان کی بنیاد پر تیشہ چلاتا ہے۔ اگر ہمیں علاقائی تعصبات کو پال کر ایک دوسرے سے الگ ہونا بلکہ باہم دست و گریباں ہو جانا تھا تو پاکستان کے قیام اور اس مقصد کے حصول کے لیے آگ اور خون کے سمندر سے گزرنے کی آخر ضرورت کیا تھی ؟ ان تعصبات کو بڑی آسانی کے ساتھ متحدہ ہندوستان میں پالا جا سکتا تھا۔ اور ان مفادات کے لیے بغیر کسی دقت کے وہاں بھی جھگڑے کھڑے کیے جا سکتے تھے۔ کیا لاکھوں بے گناہ انسانوں کا خون، لاتعداد عفت مآب بیٹیوں کی عصمت کی بربادی اور بھارت میں رہنے والے کروڑوں مسلمانوں کی مظلومیت اور ان کے رُوح فرسا مصائب اِن علاقائی رہنماؤں کی نظر میں محض کھیل تماشا

کی حیثیت رکھتے تھے ؟ ہمیں ملی نقطۂ نظر سے سوچنے کے بجائے علاقائی مفادات کے تحت ہی سوچنا ہے تو پھر مال و جان کا یہ عظیم زیاں کس لیے کیا گیا ؟ آخر غور کیجیے کہ ہماری ان مجنونانہ حرکات سے ان روحوں پر کیا گزرتی ہو گی جنہیں تقسیمِ ملک اور اس کے بعد محض مسلمان اور تحریکِ پاکستان کا حامی ہونے کی وجہ سے ناقابلِ بیان مظالم کا تختۂ مشق بنایا گیا۔

ہم علاقائی مفادات کے مخالف نہیں بلکہ علاقائی تعصبات کے دشمن ہیں۔ ہم ظلم و ناانصافی کی ہر صورت کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اس بات کے دل و جان سے قائل ہیں کہ پاکستان کے ہر علاقے اور ہر طبقے کو اس کے جائز حقوق ملیں اور اُن کے ساتھ جو بے انصافیاں ماضی میں ہوئی ہیں ان کا پوری طرح تدارک ہو۔ مگر ہم اس بات کو بالکل غلط بلکہ تباہ کُن سمجھتے ہیں کہ علاقائی مفادات کی آڑ میں علاقائی تعصبات کو ہوا دی جائے اور ان عصبیتوں کو اُبھارا جائے جنہیں اسلام دنیا سے مٹانے آیا ہے۔ ہم اس چیز کو بھی منطقی اعتبار سے بالکل غلط سمجھتے ہیں کہ مختلف علاقوں کے مفادات پاکستان کے حصے بخرے کرنے ہی سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ ہمارے نزدیک پاکستان کی حیثیت جسم کی سی ہے اور اس کے اندر موجود علاقے اس کے مختلف اعضاء و جوارح ہیں۔ ہر عضو جسم سے پوری طرح پیوستہ رہ کر ہی مفید اور کارآمد ہو سکتا اور اپنے فرائض خوش اسلوبی کے ساتھ سرانجام دے سکتا ہے۔ اگر اس کا تعلق جسم سے ٹوٹ جائے تو وہ نہ صرف سراسر بیکار ہو جاتا ہے بلکہ تعفن کا شکار ہو کر مضرت رساں بن جاتا ہے۔ آخر یہ کیونکر فرض کر لیا گیا ہے کہ جب تک پاکستان کے حصے بخرے نہ ہو جائیں اس وقت تک اس کے مختلف حصوں کو اپنے حقوق حاصل نہ ہو سکیں گے۔ دنیا میں اتحاد و اتفاق ہی قوت و طاقت کا سرچشمہ ہے، مگر ہمارے ہاں بعض مفاد پرست انتشار میں قوم کی فلاح ڈھونڈ رہے ہیں۔ اگر ملک میں ایک ایسی نمائندہ حکومت بن جائے جو اسلامی تعلیمات کے نفاذ کے لیے کوشاں ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ تمام علاقے ایک دوسرے سے پوری طرح متحد رہ کر ایک دوسرے سے قوت و طاقت حاصل نہ کریں۔

مرزا غلام احمد قادیانی کے ماننے والوں کی یہ ایک عجیب و غریب عادت ہے کہ وہ خود جو چاہے کہتے رہیں لیکن اگر کوئی دوسرا کوئی معقول سے معقول بات بھی کرے تو وہ فوراً یہ دہائی دینا شروع کر دیتے ہیں کہ دیکھیے یہ لوگ ملک میں انتشار پھیلا رہے ہیں۔ ایک بالکل تازہ واقعہ سے آپ اس ذہنیت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ جماعت اسلامی پاکستان نے اپنے منشور میں علاوہ اور بہت سی باتوں کے ایک یہ بات بھی بیان کی تھی کہ جو لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی اور شخص کی نبوت کے قائل ہیں اُن کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے گا۔ اِس شق کا چھپنا تھا کہ اس حلقے نے پورے ملک میں طوفان اٹھا دیا اور اس طرح واویلا کرنا شروع کیا کہ گویا آسمان ان پر گرنے والا ہے۔ پریس میں اس موضوع کو اچھالا گیا۔ دوسرے بے دین طبقوں کے ساتھ مل کر جماعت اسلامی کو جی بھر کر گالیاں دی گئیں۔ جماعت کی اِس "جسارت" کو اربابِ اقتدار کے سامنے اس انداز سے پیش کیا گیا کہ یہ بات ملک کے لیے عظیم خطرہ ہے۔ لیکن رب العزت کی شانِ کریمی ملاحظہ ہو کہ جماعت اسلامی کی جس بات سے یہ لوگ اتنے برافروختہ ہوئے ہیں اس کا اظہار ان کی اپنی زبان اور قلم سے اکثر اوقات ہوتا رہتا ہے۔ یہ لوگ درحقیقت اپنے آپ کو اُمتِ مسلمہ سے الگ امت سمجھتے ہیں اور اس امت کے بارے میں وہ وہی جذبات و احساسات رکھتے ہیں جو ایک غیر مسلم قوم رکھتی ہے۔ آپ ۱۰ دسمبر ۱۹۶۹ء کے الفضل کا پہلا صفحہ ملاحظہ فرمائیں اور ذرا اس عبارت پر غور کریں:

> "اللہ تعالیٰ کی مشیت یہ ہے کہ احمدیت دنیا کے دُور دراز کناروں
> تک پہنچے گی اور ایک وقت آئے گا کہ احمدیوں کی اکثریت ہوگی
> اور باقی مسلمان اقلیت بن جائیں گے۔"

ہم اس اقتباس پر کوئی تبصرہ نہیں کرنا چاہتے۔ یہ عبارت اتنی واضح ہے کہ اسے ہر شخص اس کے پورے مضمرات کے ساتھ اچھی طرح سمجھ سکتا ہے۔ ہم پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا اس گروہ کو اس امر کی پوری آزادی ہے کہ وہ جو چاہے کہتا رہے اور اس پر قطعاً کوئی گرفت نہ کی جائے اور اگر ہم کوئی بات کہہ دیں تو وہ قابلِ گرفت ہو؟ کیا ہم وہی بات نہیں کہہ رہے ہیں جس کا اظہار خود ان کی اپنی زبان سے

وقتاً فوقتاً ہوتا رہتا ہے کہ وہ اگر مسلمانوں کو اقلیت بنانے کے خواب دیکھیں اور اسے اپنی صداقت کا نشان ٹھہرائیں تو یہ بات کسی طرح بھی اشتعال انگیز نہیں لیکن اگر مسلمان ان کی اسی خواہش کو سامنے رکھ کر ان سے یہ کہیں کہ وہ امتِ مسلمہ سے الگ ایک اقلیت ہیں تو اس معقول تجویز کے خلاف طوفان کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ اپنے اس موقف پر انہیں خود سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے۔

اس وقت پورے ملک میں مارشل لا نافذ ہے مگر اس کے باوجود یہاں قتل و غارت، ڈاکہ زنی، اغوا اور اسی نوعیت کے دوسرے بیسیوں جرائم میں بڑی سرعت کے ساتھ اضافہ ہو رہا ہے اور سماج دشمن عناصر بڑی دلیری کے ساتھ اور قانون سے قطعاً بے خوف ہو کر انتہائی سنگین قسم کی وارداتیں کر رہے ہیں۔ یہ صورتِ حال سخت تشویشناک ہے۔ اگر کسی معاشرے کے اندر یہ احساس پیدا ہو جائے کہ حکومت کی انتظامی مشینری اس کی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت نہیں کر سکتی اور ملک کا قانون اس معاملے میں بے بس ہے تو قوم کے اندر مایوسی پیدا ہو جاتی ہے جو قومی نقطۂ نظر سے ایک نہایت خوفناک مرض ہے۔ جب ایک فرد مایوسی کے عالم میں تعمیری اندازِ فکر سے محروم ہو کر اپنی زندگی کو بے دریغ کسی خطرناک داؤ پر لگا دیتا ہے تو ایک مایوس معاشرے سے یہ امید کیسے کی جا سکتی ہے کہ وہ اس حالت میں مبتلا ہو کر انارکی کے راستے پر جانے سے بچا رہ جائے گا۔ لہٰذا اس وقت اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ قوم کے اندر مایوسی جیسے موذی مرض کو مزید سرایت کرنے کا موقع نہ دیا جائے۔ اس غرض کے لیے جہاں سماج دشمن عناصر کا بڑی سختی کے ساتھ اور بلا رو رعایت احتساب ضروری ہے، وہاں اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ حکومت مظلوموں کی دادرسی کا کوئی ایسا انتظام کرے جو سہل اور سادہ ہونے کے علاوہ موثر بھی ہو تاکہ عوام کے اندر پھر سے یہ احساس پیدا ہو کہ حکومت ان سے اور ان کے مصائب سے غافل نہیں ہے بلکہ انہیں دور کرنے کے لیے سچے دل سے فکرمند ہے۔ ہمیں یہ تسلیم ہے کہ یہاں مخلص، ایماندار، محنتی اور فرض شناس اہل کاروں کی دن بدن کمی ہوتی جا رہی ہے۔ لیکن ابھی ان کا قحط نہیں ہوا۔ حکومت اپنی انتظامی مشینری میں سے مستعد اور دیانتدار افسروں کی ایک معقول تعداد منتخب کر کے احتساب کا ایک ایسا موثر نظام قائم کر سکتی ہے جس سے ظلم کی روک تھام کے لیے خاطر خواہ کام لیا جا سکتا ہے۔

تفہیم القرآن

القلم

نام اس کا نام سورۂ ن بھی ہے اور القلم بھی۔ دونوں الفاظ سورۃ کے آغاز ہی میں موجود ہیں۔

زمانۂ نزول یہ بھی مکہ معظمہ کے ابتدائی دور کی نازل شدہ سورتوں میں سے ہے، مگر اس کے مضمون سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ یہ اُس زمانے میں نازل ہوئی تھی جب مکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی مخالفت اچھی خاصی شدّت اختیار کر چکی تھی۔

موضوع اور مضمون اس میں تین مضامین بیان ہوئے ہیں۔ مخالفین کے اعتراضات کا جواب، اُن کو تنبیہ اور نصیحت، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو صبر و استقامت کی تلقین۔

آغازِ کلام میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے ارشاد ہُوا ہے کہ یہ کفار تم کو دیوانہ کہتے ہیں، حالانکہ جو کتاب تم پیش کر رہے ہو اور اخلاق کے جس اعلیٰ مرتبے پر تم فائز ہو وہ، خود اِن کے اِس جھوٹ کی تردید کے لیے کافی ہے عنقریب وہ وقت آنے والا ہے جب سب ہی دیکھ لیں گے کہ دیوانہ کون تھا اور فرزانہ کون۔ لہٰذا مخالفت کا جو طوفان تمہارے خلاف اٹھایا جا رہا ہے اس کا دباؤ ہرگز قبول نہ کرو۔ دراصل یہ ساری باتیں اس لیے کی جا رہی ہیں کہ تم کسی نہ کسی طرح دب کر ان سے مصالحت (COMPROMISE) کرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔

پھر عوام کی آنکھیں کھولنے کے لیے نام لیے بغیر مخالفین میں سے ایک نمایاں شخص کا کردار پیش کیا گیا ہے جسے اہلِ مکہ خوب جانتے تھے۔ اُس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے پاکیزہ اخلاق بھی سب کے سامنے تھے، اور ہر دیکھنے والا یہ بھی دیکھ سکتا تھا کہ آپ کی مخالفت میں مکہ

کے جو سردار پیش پیش ہیں اُن میں کس سیرت و کردار کے لوگ شامل ہیں۔

اس کے بعد آیت ۱۷ سے ۳۳ تک ایک باغ والوں کی مثال پیش کی گئی ہے جنہوں نے اللہ سے نعمت پا کر اُس کی ناشکری کی اور اُن کے اندر جو شخص سب سے بہتر تھا اس کی نصیحت بروقت نہ مانی، آخر کار وہ اُس نعمت سے محروم ہو گئے اور اُن کی آنکھیں اُس وقت کھلیں جب اُن کا سب کچھ برباد ہو چکا تھا۔ یہ مثال دے کر اہلِ مکہ کو متنبہ کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے تم بھی اسی آزمائش میں پڑ گئے ہو جس میں وہ باغ والے پڑے تھے۔ اگر ان کی بات نہ مانو گے تو دنیا میں بھی عذاب بھگتو گے اور آخرت کا عذاب اس سے بھی زیادہ بڑا ہے۔

پھر آیت ۳۴ سے ۴۷ تک مسلسل کفار کو فہمائش کی گئی ہے جس میں کہیں تو خطاب براہِ راست اُن سے ہے اور کہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے دراصل تنبیہ اُن کو کی گئی ہے۔ اس سلسلہ میں جو باتیں ارشاد ہوئی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ آخرت کی بھلائی لازماً اُنہی لوگوں کے لیے ہے جنہوں نے دنیا میں خدا ترسی کے ساتھ زندگی بسر کی ہے یہ بات سراسر عقل کے خلاف ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں فرمانبرداروں کا انجام وہ ہو جو مجرموں کا ہونا چاہیے۔ کفار کی یہ غلط فہمی قطعی بے بنیاد ہے کہ خدا ان کے ساتھ وہ معاملہ کرے گا جو وہ خود اپنے لیے تجویز کرتے ہیں، حالانکہ اِس کے لیے انہیں کوئی ضمانت حاصل نہیں ہے۔ جن لوگوں کو دنیا میں خدا کے آگے جھکنے کی دعوت دی جا رہی ہے اور وہ اس سے انکار کرتے ہیں، قیامت کے روز وہ سجدہ کرنا چاہیں گے بھی تو نہ کر سکیں گے اور ذلت کا انجام انہیں دیکھنا پڑے گا قرآن کو جھٹلا کر وہ خدا کے عذاب سے بچ نہیں سکتے۔ اُنہیں جو ڈھیل دی جا رہی ہے اس سے وہ دھوکے میں پڑ گئے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اس تکذیب کے باوجود جب اُن پر عذاب نہیں آ رہا ہے تو وہ صحیح راستے پر ہیں؛ حالانکہ وہ بے خبری میں ہلاکت کی راہ پر چلے جا رہے ہیں۔ اُن کے پاس رسول کی مخالفت کے لیے کوئی معقول وجہ نہیں ہے، کیونکہ وہ ایک بے غرض مبلغ ہے، اپنی ذات کے لیے اُن سے کچھ نہیں مانگ رہا ہے، اور وہ یہ دعویٰ بھی نہیں کر سکتے کہ اُنہیں اس کے رسول نہ ہونے اور اس کی باتوں کے غلط

ہونے کا علم حاصل ہے۔

آخر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت فرمائی گئی ہے کہ اللہ کا فیصلہ آنے تک جو سختیاں بھی تبلیغِ دین کی راہ میں پیش آئیں اُن کو صبر کے ساتھ برداشت کرتے چلے جائیں اور اُس بے صبری سے بچیں جو یونس علیہ السلام کے لیے ابتلا کی موجب بنی تھی۔

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے

نٓ۔ قسم ہے قلم کی اور اُس چیز کی جسے لکھنے والے لکھ رہے ہیں[1]۔ تم اپنے رب کے فضل سے مجنون نہیں ہو[2]۔

---

[1] امامِ تفسیر مُجاہد کہتے ہیں کہ قلم سے مراد وہ قلم ہے جس سے ذکر، یعنی قرآن لکھا جا رہا تھا۔ اس سے خود بخود یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ چیز جو لکھی جا رہی تھی اُس سے مراد قرآن مجید ہے۔

[2] یہ ہے وہ بات جس پر قلم اور کتاب کی قسم کھائی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ قرآن جو کاتبینِ وحی کے ہاتھوں سے ثبت ہو رہا ہے، بجائے خود کفار کے اِس بہتان کی تردید کے لیے کافی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوائے نبوت سے پہلے تو اہلِ مکہ آپ کو اپنی قوم کا بہترین آدمی مانتے تھے اور آپ کی دیانت و امانت اور عقل و فراست پر اعتماد رکھتے تھے۔ مگر جب آپ نے ان کے سامنے قرآن پیش کرنا شروع کیا تو وہ آپ کو دیوانہ قرار دینے لگے۔ اس کے معنی یہ تھے کہ قرآن ہی اُن کے نزدیک وہ سبب تھا جس کی بنا پر انہوں نے آپ پر دیوانگی کی تہمت لگائی۔ اس لیے فرمایا گیا کہ قرآن ہی اِس تہمت کی تردید کے لیے کافی ثبوت ہے۔ یہ اعلیٰ درجہ کا فصیح و بلیغ کلام جو ایسے بلند پایہ مضامین پر مشتمل ہے، اِس کا پیش کرنا تو اس بات کی دلیل ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ کا خاص فضل ہوا ہے، کجا کہ اسے اس امر کی دلیل بنایا جائے کہ آپ معاذ اللہ دیوانے ہو گئے ہیں۔ اس مقام پر یہ بات نگاہ میں رہنی چاہیے کہ یہاں خطاب تو بظاہر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے، لیکن اصل مقصود کفار کو ان کی تہمت کا جواب دینا ہے۔ لہٰذا کسی شخص کو یہ شبہ نہ ہو کہ یہ آیت حضورؐ کو یہ اطمینان دلانے کے لیے نازل ہوئی ہے کہ آپ مجنون نہیں ہیں۔ ظاہر ہے کہ حضورؐ کو اپنے متعلق تو ایسا کوئی شبہ نہ تھا کہ اسے دُور کرنے کے لیے آپ کو یہ اطمینان دلانے کی ضرورت ہوتی۔ مدعا کفار سے یہ کہنا ہے کہ تم جس قرآن کی وجہ سے اس کے پیش کرنے والے کو

اور یقیناً تمہارے لیے ایسا اجر ہے جس کا سلسلہ کبھی ختم ہونے والا نہیں۳؎ اور بے شک تم اخلاق کے بڑے مرتبے پر ہو۴؎۔ عنقریب تم بھی دیکھ لوگے اور وہ بھی دیکھ لیں گے کہ تم میں سے کون جنون میں مبتلا ہے۔ تمہارا

مجنون کہہ رہے ہو وہی تمہارے اس الزام کے جھوٹے ہونے کی دلیل ہے۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد پنجم، تفسیر سورۂ طور، حاشیہ ۲۲)

۳؎ یعنی آپ کے لیے اِس بات پر بے حساب اور لازوال اجر ہے کہ آپ خلقِ خدا کی ہدایت کے لیے جو کوششیں کر رہے ہیں اُن کے جواب میں آپ کو ایسی ایسی اذیت ناک باتیں سُننی پڑ رہی ہیں اور پھر بھی آپ اپنے اِس فرض کو انجام دیئے چلے جا رہے ہیں۔

۴؎ اِس مقام پر یہ فقرہ دو معنی دے رہا ہے۔ ایک یہ کہ آپ اخلاق کے بہت بلند مرتبے پر فائز ہیں اسی وجہ سے آپ ہدایتِ خلق کے کام میں یہ اذیتیں برداشت کر رہے ہیں، ورنہ ایک کمزور اخلاق کا انسان یہ کام نہیں کر سکتا تھا۔ دوسرے یہ کہ قرآن کے علاوہ آپ کے بلند اخلاق بھی اِس بات کا صریح ثبوت ہیں کہ کفار آپ پر دیوانگی کی جو تہمت رکھ رہے ہیں وہ سراسر جھوٹی ہے، کیونکہ اخلاق کی بلندی اور دیوانگی، دونوں ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں۔ دیوانہ وہ شخص ہوتا ہے جس کا ذہنی توازن بگڑا ہوا ہو اور جس کے مزاج میں اعتدال باقی نہ رہا ہو۔ اس کے برعکس آدمی کے بلند اخلاق اِس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ وہ نہایت صحیح الدماغ اور سلیم الفطرت ہے اور اُس کا ذہن اور مزاج غایت درجہ متوازن ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق جیسے کچھ تھے، اہلِ مکہ اُن سے ناواقف نہ تھے۔ اس لیے اُن کی طرف محض اشارہ کر دینا ہی اِس بات کے لیے کافی تھا کہ مکہ کا ہر معقول آدمی یہ سوچنے پر مجبور ہو جائے کہ وہ لوگ کس قدر بے شرم ہیں جو ایسے بلند اخلاق آدمی کو مجنون کہہ رہے ہیں۔ ان کی یہ بیہودگی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے نہیں بلکہ خود اُن کے لیے نقصان دہ تھی کہ مخالفت کے جوش میں پاگل ہو کر وہ آپ کے متعلق ایسی بات کہہ رہے تھے جسے کوئی ذی فہم آدمی قابلِ تصور نہ مان سکتا تھا۔ یہی معاملہ اُن مدعیانِ علم و تحقیق کا بھی ہے جو اِس زمانے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر مرگی اور جنون کی تہمت رکھ رہے ہیں۔ قرآنِ پاک دنیا میں ہر جگہ مل سکتا ہے، اور حضورؐ کی سیرت بھی اپنی تمام تفصیلات کے ساتھ لکھی ہوئی موجود ہے۔ ہر شخص خود دیکھ سکتا ہے کہ جو لوگ اِس بے مثل کتاب کے پیش کرنے

رب اُن لوگوں کو بھی خوب جانتا ہے جو اس کی راہ سے بھٹکے ہوئے ہیں، اور وہی ان کو بھی اچھی طرح جانتا ہے جو راہ راست پر ہیں۔ لہٰذا تم اِن جھٹلانے والوں کے دباؤ میں ہرگز نہ آؤ۔ یہ تو چاہتے ہیں کہ کچھ

نا ہے اور ایسے بلند اخلاق رکھنے والے انسان کو ذہنی مریض قرار دیتے ہیں وہ عداوت کے اندھے جذبے سے مغلوب ہو کر کیسی لغو بات کہہ رہے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کی بہترین تعریف حضرت عائشہؓ نے اپنے اِس قول میں فرمائی ہے کہ کان خلقہ القرآن "قرآن آپ کا اخلاق تھا" امام احمد، مسلم، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ، دارمی اور ابن جریر نے تھوڑے سے لفظی اختلاف کے ساتھ اُن کا یہ قول متعدد سندوں سے نقل کیا ہے۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کے سامنے محض قرآن کی تعلیم ہی پیش نہیں کی تھی بلکہ خود اس کا مجسم مونہ بن کر دکھا دیا تھا۔ جس چیز کا قرآن میں حکم دیا گیا آپ نے خود سب سے بڑھ کر اس پر عمل کیا، جس چیز سے اس میں روکا گیا آپ نے خود سب سے زیادہ اُس سے اجتناب فرمایا، جن اخلاقی صفات کو اس میں فضیلت قرار دیا گیا سب سے بڑھ کر آپ کی ذات اُن سے متصف تھی، اور جن صفات کو اس میں ناپسندیدہ ٹھیرایا گیا سب سے زیادہ آپ اُن سے پاک تھے۔ ایک اور روایت میں حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کسی خادم کو نہیں مارا، کبھی کسی عورت پر ہاتھ نہ اٹھایا، جہاد فی سبیل اللہ کے سوا کبھی آپ نے اپنے ہاتھ سے کسی کو نہیں مارا۔ اپنی ذات کے لیے کبھی کسی ایسی تکلیف کا انتقام نہیں لیا جو آپ کو پہنچائی گئی ہو الا یہ کہ اللہ کی حرمتوں کو توڑا گیا ہو اور آپ نے اللہ کی خاطر اُس کا بدلہ لیا ہو، اور آپ کا طریقہ یہ تھا کہ جب دو کاموں میں سے ایک کا آپ کو انتخاب کرنا ہوتا تو آپ آسان تر کام کو پسند فرماتے تھے، الّا یہ کہ وہ گناہ ہو، اور اگر کوئی کام گناہ ہوتا تو آپ سب سے زیادہ اس سے دُور رہتے تھے" (مسند احمد)۔ حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ "میں نے دس سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کی ہے۔ آپ نے کبھی میری کسی بات پر اُف تک نہ کی، کبھی میرے کسی کام پر یہ نہ فرمایا کہ تُو نے یہ کیوں کیا، اور کبھی کسی کام کے نہ کرنے پر یہ نہیں فرمایا کہ تو نے یہ کیوں نہ کیا"

(بخاری و مسلم)

تم مداہنت کرو تو یہ بھی مداہنت کریں۔[۵] ہرگز نہ دبو کسی ایسے شخص سے جو بہت قسمیں کھانے والا بے وقعت آدمی[۶] ہے، طعنے دیتا ہے، چغلیاں کھاتا پھرتا ہے، بھلائی سے روکتا ہے[۷]، ظلم و زیادتی میں حد سے گزر جانے والا ہے، سخت بداعمال ہے، جفا کار ہے[۸]، اور ان سب عیوب کے ساتھ بد اصل ہے[۹]،

---

۵ یعنی تم اسلام کی تبلیغ میں کچھ ڈھیلے پڑ جاؤ تو یہ بھی تمہاری مخالفت میں کچھ نرمی اختیار کریں، یا تم ان کی گمراہیوں کی رعایت کر کے اپنے دین میں کچھ ترمیم کرنے پر آمادہ ہو جاؤ تو یہ تمہارے ساتھ مصالحت کر لیں۔

۶ اصل میں لفظ مَہِین استعمال ہوا ہے جو حقیر و ذلیل اور گھٹیا آدمی کے لیے بولا جاتا ہے۔ درحقیقت یہ بہت قسمیں کھانے والے آدمی کی لازمی صفت ہے۔ وہ بات بات پر اس لیے قسم کھاتا ہے کہ اُسے خود یہ احساس ہوتا ہے کہ لوگ اسے جھوٹا سمجھتے ہیں اور اس کی بات پر اُس وقت تک یقین نہیں کریں گے جب تک وہ قسم نہ کھائے۔ اس بنا پر وہ اپنی نگاہ میں خود بھی ذلیل ہوتا ہے اور معاشرے میں بھی اس کی کوئی وقعت نہیں ہوتی۔

۷ اصل میں مَنَّاعٍ لِّلْخَیْرِ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ خیر عربی زبان میں مال کو بھی کہتے ہیں اور بھلائی کو بھی۔ اگر اس کو مال کے معنی میں لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ وہ سخت بخیل اور کنجوس آدمی ہے، کسی کو پھوٹی کوڑی دینے کا بھی روادار نہیں۔ اور اگر خیر کو نیکی اور بھلائی کے معنی میں لیا جائے تو اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ ہر نیک کام میں رکاوٹ ڈالتا ہے، اور یہ بھی کہ وہ اسلام سے لوگوں کو روکنے میں بہت سرگرم ہے۔

۸ اصل میں لفظ عُتُلّ استعمال ہوا ہے جو عربی زبان میں ایسے شخص کے لیے بولا جاتا ہے جو خوب ہٹا کٹا اور بہت کھانے پینے والا ہو، اور اس کے ساتھ نہایت بدخلق، جھگڑالو اور سفاک ہو۔

۹ اصل میں لفظ زَنِیم استعمال ہوا ہے۔ کلامِ عرب میں یہ لفظ اُس ولدالزنا کے لیے بولا جاتا ہے جو دراصل ایک خاندان کا فرد نہ ہو مگر اس میں شامل ہو گیا ہو۔ سعید بن جُبیر اور شَعبی کہتے ہیں کہ یہ لفظ اُس شخص کے لیے بھی بولا جاتا ہے جو لوگوں میں اپنے شر کی وجہ سے معروف و مشہور ہو۔

اِن آیات میں جس شخص کے یہ اوصاف بیان کیے گئے ہیں اُس کے بارے میں مفسرین کے اقوال مختلف ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ شخص وَلید بن مُغیرہ تھا۔ کسی نے اَسْوَد بن عبد یغوث کا نام لیا ہے۔ کسی نے اَخْنَس بن شَرِیق کو اس کا مصداق ٹھیرایا ہے۔ اور بعض لوگوں نے کچھ دوسرے اشخاص کی نشاندہی کی ہے۔ لیکن قرآن مجید میں نام

اِس بنا پر کہ وہ بہت مال و اولاد رکھتا ہے[۱۰]۔ جب ہماری آیات اس کو سنائی جاتی ہیں تو کہتا ہے یہ تو اگلے وقتوں کے افسانے ہیں۔ عنقریب ہم اس کی سونڈ پر داغ لگائیں گے[۱۱]۔

ہم نے اِن (اہلِ مکہ) کو اُسی طرح آزمائش میں ڈالا ہے جس طرح ایک باغ کے مالکوں کو آزمائش میں ڈالا تھا[۱۲]، جب اُنھوں نے قسم کھائی کہ صبح سویرے ضرور اپنے باغ کے پھل توڑیں گے اور وہ کوئی استثنا نہیں کر رہے تھے[۱۳]۔ رات کو وہ سوئے پڑے تھے کہ تمہارے رب کی طرف سے ایک بلا اُس باغ پر پھر گئی اور اُس کا ایسا حال ہو گیا جیسے کٹی ہوئی فصل ہو۔ صبح اُن لوگوں نے ایک دوسرے کو پکارا کہ اگر پھل توڑنے ہیں تو سویرے سویرے اپنی کھیتی[۱۴] کی طرف نکل چلو۔ چنانچہ وہ چل پڑے اور آپس میں چپکے

لیے بغیر صرف اُس کے اوصاف بیان کر دیئے گئے ہیں۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ مکہ میں وہ اپنے اِن اوصاف کے لیے اِتنا مشہور تھا کہ اس کا نام لینے کی ضرورت نہ تھی۔ اس کی یہ صفات سنتے ہی ہر شخص سمجھ سکتا تھا کہ اشارہ کس کی طرف ہے۔

۱۰؎ اس فقرے کا تعلق اُوپر کے سلسلۂ کلام سے بھی ہو سکتا ہے اور بعد کے فقرے سے بھی۔ پہلی صورت میں مطلب یہ ہو گا کہ ایسے آدمی کی دھونس اِس بنا پر قبول نہ کرو کہ وہ بہت مال و اولاد رکھتا ہے۔ دوسری صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ بہت مال و اولاد والا ہونے کی بنا پر وہ مغرور ہو گیا ہے، جب ہماری آیات اُس کو سنائی جاتی ہیں تو کہتا ہے یہ اگلے وقتوں کے افسانے ہیں۔

۱۱؎ چونکہ وہ اپنے آپ کو بڑی ناک والا سمجھتا تھا اس لیے اس کی ناک کو سونڈ کہا گیا ہے۔ اور ناک پر داغ لگانے سے مراد تذلیل ہے۔ یعنی ہم دنیا اور آخرت میں اس کو ایسا ذلیل و خوار کریں گے کہ ابد تک یہ عار اس کا پیچھا نہ چھوڑے گا۔

۱۲؎ اِس مقام پر سورۂ کہف رکوع ۵ بھی پیشِ نظر رہے جس میں اِسی طرح عبرت دلانے کے لیے دو باغ والوں کی مثال پیش کی گئی ہے۔

۱۳؎ یعنی انہیں اپنی قدرت اور اپنے اختیار پر ایسا بھروسہ تھا کہ قسم کھا کر بے تکلف کہہ دیا کہ ہم ضرور کل اپنے باغ کے پھل توڑیں گے اور یہ کہنے کی کوئی ضرورت وہ محسوس نہیں کرتے تھے کہ اگر اللہ نے چاہا تو ہم یہ کام کریں گے۔

چپکے کہتے جاتے تھے کہ آج کوئی مسکین تمہارے پاس باغ میں نہ آنے پائے۔ وہ کچھ نہ دینے کا فیصلہ کیے ہوئے صبح سویرے جلدی جلدی[۱۵] اِس طرح وہاں گئے جیسے کہ وہ پھل توڑنے پہ قادر ہیں۔ مگر جب باغ کو دیکھا تو کہنے لگے "ہم راستہ بھول گئے ہیں، ـــــــ نہیں، بلکہ ہم محروم رہ گئے۔"[۱۶] اُن میں جو سب سے بہتر آدمی تھا اس نے کہا "میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ تم تسبیح کیوں نہیں کرتے؟"[۱۷] وہ پکار اٹھے "پاک ہے ہمارا رب، واقعی ہم گناہ گار تھے۔" پھر اُن میں سے ہر ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگا۔[۱۸] آخر کو انہوں نے کہا "افسوس ہمارے حال پر۔ بے شک ہم سرکش ہوگئے تھے۔ بعید نہیں کہ ہمارا رب ہمیں بدلے میں اس سے بہتر باغ عطا فرمائے، ہم اپنے رب کی طرف رجوع کرتے ہیں۔"

ع ۱ ایسا ہوتا ہے عذاب۔ اور آخرت کا عذاب اِس سے بھی بڑا ہے، کاش یہ لوگ اِس کو جانتے۔

یقیناً[۱۹] خدا ترس لوگوں کے لیے اُن کے رب کے ہاں نعمت بھری جنتیں ہیں۔ کیا ہم فرمانبرداروں

۱۴؎ کھیتی کا لفظ غالباً اس لیے استعمال کیا گیا ہے کہ باغ میں درختوں کے درمیان کھیت بھی تھے۔

۱۵؎ اصل الفاظ ہیں عَلٰی حَرْدٍ۔ حرد عربی زبان میں روکنے اور نہ دینے کے لیے بھی بولا جاتا ہے، قصد اور ارادے کے لیے بھی، اور جلدی کے لیے بھی۔ فیصلے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے، اور سُرعت کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔ اسی لیے ہم نے ترجمے میں تینوں معنوں کی رعایت ملحوظ رکھی ہے۔

۱۶؎ یعنی پہلے تو انہیں باغ کو دیکھ کر یقین نہ آیا کہ یہ انہی کا باغ ہے اور کہنے لگے شاید ہم راستہ بھول کر کسی اور جگہ نکل آئے ہیں، پھر جب غور کیا اور معلوم ہوا کہ یہ ان کا اپنا باغ ہی ہے تو چیخ اٹھے کہ ہماری قسمت پھوٹ گئی۔

۱۷؎ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب وہ قسم کھا کر کہہ رہے تھے کہ کل ہم اپنے باغ کے پھل ضرور توڑیں گے اُس وقت اِس شخص نے ان کو تنبیہ کی تھی کہ تم خدا کو بھول گئے، ان شاء اللہ کیوں نہیں کہتے؟ مگر انہوں نے اس کی پروا نہ کی۔ پھر جب وہ مسکینوں کو کچھ نہ دینے کا فیصلہ کر رہے تھے اُس وقت بھی اس نے انہیں نصیحت کی کہ اللہ کو یاد کرو اور اس بُری نیت سے باز آجاؤ، مگر وہ اپنی بات پر جمے رہے۔

۱۸؎ یعنی ہر ایک نے دوسرے کو الزام دینا شروع کیا کہ اُس کے بہکانے سے ہم اِس خدا فراموشی اور

کا حال مجرموں کا سا کر دیں؟ تم لوگوں کو کیا ہو گیا ہے، تم کیسے حکم لگاتے ہو[۲۰]؟ کیا تمہارے پاس کوئی کتاب[۲۱] ہے جس میں تم یہ پڑھتے ہو کہ تمہارے لیے ضرور وہاں وہی کچھ ہے جو تم اپنے لیے پسند کرتے ہو؟ یا پھر کیا تمہارے لیے روزِ قیامت تک ہم پر کچھ عہد و پیمان ثابت ہیں کہ تمہیں وہی کچھ ملے گا جس کا تم حکم لگاؤ؟ اِن سے پوچھو تم میں سے کون اس کا ضامن ہے[۲۲]؟ یا پھر اِن کے ٹھیرائے ہوئے کچھ شریک ہیں (جنھوں نے اِس کا ذمہ لیا ہو)؟ یہ بات ہے تو لائیں اپنے اُن شریکوں کو اگر یہ سچے ہیں[۲۳]۔

بدنیتی میں مبتلا ہوئے۔

۱۹؎ مکّہ کے بڑے بڑے سردار مسلمانوں سے کہتے تھے کہ ہم کو یہ نعمتیں جو دنیا میں مل رہی ہیں، یہ خدا کے ہاں ہمارے مقبول ہونے کی علامت ہیں، اور تم جس بدحالی میں مبتلا ہو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ تم خدا کے مغضوب ہو۔ لہٰذا اگر کوئی آخرت ہوئی بھی، جیسا کہ تم کہتے ہو، تو ہم وہاں بھی مزے کریں گے اور عذاب تم پر ہوگا نہ کہ ہم پر۔ اس کا جواب اِن آیات میں دیا گیا ہے۔

۲۰؎ یعنی یہ بات عقل کے خلاف ہے کہ خدا فرمانبردار اور مجرم میں تمیز نہ کرے۔ تمہاری سمجھ میں آخر کیسے یہ بات آتی ہے کہ کائنات کا خالق کوئی اندھا راجہ ہے جو یہ نہیں دیکھے گا کہ کن لوگوں نے دنیا میں اس کے احکام کی اطاعت کی اور بُرے کاموں سے پرہیز کیا، اور کون لوگ تھے جو اُس سے بے خوف ہو کر ہر طرح کے گناہ اور جرائم اور ظلم و ستم کرتے رہے؟ تم نے ایمان لانے والوں کی خستہ حالی اور اپنی خوشحالی تو دیکھ لی، مگر اپنے اور اُن کے اخلاق و اعمال کا فرق نہیں دیکھا اور بے تکلف حکم لگا دیا کہ خدا کے ہاں اِن فرمانبرداروں کے ساتھ تو مجرموں کا سا معاملہ کیا جائے گا، اور تم جیسے مجرموں کو جنت عطا کر دی جائے گی۔

۲۱؎ یعنی اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی کتاب۔

۲۲؎ اصل میں لفظ زعیم استعمال ہوا ہے۔ کلامِ عرب میں زعیم اس شخص کو کہتے ہیں جو کفیل، یا ضامن، یا کسی قوم کی طرف سے بولنے والا ہو۔ مطلب یہ ہے کہ تم میں سے کون آگے بڑھ کر یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس نے اللہ سے تمہارے لیے ایسا کوئی عہد و پیمان لے لیا ہے۔

۲۳؎ یعنی تم اپنے حق میں جو حکم لگا رہے ہو اس کے لیے سرے سے کوئی بنیاد نہیں ہے۔ یہ عقل کے بھی خلاف ہے۔

جس روز سخت وقت آ پڑے گا[۲۴] اور لوگوں کو سجدہ کرنے کے لیے بلایا جائے گا تو یہ لوگ سجدہ نہ کر سکیں گے۔ اِن کی نگاہیں نیچی ہوں گی، ذلت اِن پر چھا رہی ہوگی۔ یہ جب صحیح و سالم تھے اُس وقت انہیں سجدے کے لیے بلایا جاتا تھا اور یہ انکار کرتے تھے[۲۵]۔

پس اَے نبی، تم اِس کلام کے جھٹلانے والوں کا معاملہ مجھ پر چھوڑ دو[۲۶]۔ ہم ایسے طریقہ سے ان کو بتدریج تباہی کی طرف لے جائیں گے کہ ان کو خبر بھی نہ ہوگی[۲۷]۔ میں اِن کی رسّی دراز کر رہا ہوں، میری چال بڑی زبردست ہے[۲۸]۔

خدا کی کسی کتاب میں بھی تم یہ لکھا ہوا نہیں دکھا سکتے۔ تم میں سے کوئی یہ دعویٰ بھی نہیں کر سکتا کہ اُس نے خدا سے ایسا کوئی عہد لے لیا ہے۔ اور جن کو تم نے معبود بنا رکھا ہے اُن میں سے بھی کسی سے تم یہ شہادت نہیں دلوا سکتے کہ خدا کے ہاں تمہیں جنت دلوا دینے کا وہ ذمّہ لیتا ہے۔ پھر یہ غلط فہمی آخر تمہیں کہاں سے لاحق ہو گئی؟

۲۴۔ اصل الفاظ ہیں یَوْمَ یُکْشَفُ عَنْ سَاقٍ، "جس روز پنڈلی کھولی جائے گی"۔ صحابہ اور تابعین کی ایک جماعت کہتی ہے کہ یہ الفاظ محاورے کے طور پر استعمال ہوئے ہیں۔ عربی محاورے کے مطابق سخت وقت آ پڑنے کو کشفِ ساق سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس نے بھی اس کے یہی معنی بیان کیے ہیں اور ثبوت میں کلامِ عرب سے استشہاد کیا ہے۔ ایک اور قول جو ابن عباس اور ربیع بن انس سے منقول ہے اس میں کشفِ ساق سے مراد حقائق پر سے پردہ اٹھانا لیا گیا ہے۔ اس تاویل کی رو سے معنی یہ ہوں گے کہ جس روز تمام حقیقتیں بے نقاب ہو جائیں گی اور لوگوں کے اعمال کھل کر سامنے آ جائیں گے۔

۲۵۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ قیامت کے روز علی الاعلان اس بات کا مظاہرہ کرایا جائے گا کہ دنیا میں کون اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے والا تھا اور کون اُس سے منحرف تھا۔ اِس غرض کے لیے لوگوں کو بلایا جائے گا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ بجا لائیں۔ جو لوگ دنیا میں عبادت گزار تھے وہ سجدہ ریز ہو جائیں گے۔ اور جن لوگوں نے دنیا میں اللہ کے آگے سر نیاز جھکانے سے انکار کر دیا تھا اُن کی کمر تختہ ہو جائے گی۔ اُن کے لیے یہ ممکن نہ ہوگا کہ وہاں عبادت گزار ہونے کا جھوٹا مظاہرہ کر سکیں۔ اس لیے وہ ذلت اور پشیمانی کے ساتھ کھڑے کے کھڑے رہ جائیں گے۔

کیا تم ان سے کوئی اجر طلب کر رہے ہو کہ یہ اس چٹی کے بوجھ تلے دبے جا رہے ہوں؟[۲۹] کیا ان کے پاس غیب کا علم ہے جسے یہ لکھ رہے ہوں؟[۳۰] پس اپنے رب کا فیصلہ صادر ہونے تک صبر کرو[۳۱] اور

۲۶؎ یعنی ان سے نمٹنے کی فکر میں نہ پڑو۔ ان سے نمٹنا میرا کام ہے۔

۲۷؎ بے خبری میں کسی کو تباہی کی طرف لے جانے کی صورت یہ ہے کہ ایک دشمنِ حق اور ظالم کو دنیا میں نعمتوں سے نوازا جائے، صحت، مال، اولاد اور دنیوی کامیابیاں عطا کی جائیں، جن سے دھوکا کھا کر وہ سمجھے کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں خوب کر رہا ہوں، میرے عمل میں کوئی غلطی نہیں ہے۔ اس طرح وہ حق دشمنی اور ظلم و طغیان میں زیادہ سے زیادہ غرق ہوتا چلا جاتا ہے اور نہیں سمجھتا کہ جو نعمتیں اسے مل رہی ہیں وہ انعام نہیں ہیں بلکہ درحقیقت یہ اس کی ہلاکت کا سامان ہے۔

۲۸؎ اصل میں لفظ کَید استعمال ہوا ہے جس کے معنی کسی کے خلاف خفیہ تدبیر کرنے کے ہیں۔ یہ چیز صرف اُس صورت میں ایک بُرائی ہوتی ہے جب یہ ناحق کسی کو نقصان پہنچانے کے لیے ہو۔ ورنہ بجائے خود اس میں کوئی بُرائی نہیں ہے، خصوصاً جب کسی ایسے شخص کے خلاف یہ طریقہ اختیار کیا جائے جس نے اپنے آپ کو اس کا مستحق بنا لیا ہو۔

۲۹؎ سوال بظاہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا جا رہا ہے، مگر اصل مخاطب وہ لوگ ہیں جو آپ کی مخالفت میں حد سے گزرے جا رہے تھے۔ اُن سے پوچھا جا رہا ہے کہ کیا رسول تم سے کچھ مانگ رہا ہے کہ تم اس پر اتنا بگڑ رہے ہو؟ تم خود جانتے ہو کہ وہ ایک بے غرض آدمی ہے اور جو کچھ تمہارے سامنے پیش کر رہا ہے صرف اس لیے کر رہا ہے کہ اس کے نزدیک اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔ تم نہیں ماننا چاہتے تو نہ مانو، مگر اس تبلیغ پر آخر اتنے چراغ پا کیوں ہوتے جا رہے ہو؟ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد پنجم، تفسیر سورۂ طور، حاشیہ ۳۱)۔

۳۰؎ یہ دوسرا سوال بھی بظاہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے مگر دراصل آپ کے مخالفین اس کے مخاطب ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ کیا تم لوگوں نے پردۂ غیب کے پیچھے جھانک کر دیکھ لیا ہے کہ یہ رسول فی الواقع خدا کا بھیجا ہوا رسول نہیں ہے اور جو حقیقتیں یہ تم سے بیان کر رہا ہے وہ بھی غلط ہیں، اس لیے تم اس کو جھٹلانے میں اتنی شدت برت رہے ہو؟ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر سورۂ طور، حاشیہ ۳۲)۔

۳۱؎ یعنی وہ وقت ابھی دُور ہے جب اللہ تعالیٰ تمہاری فتح و نصرت اور تمہارے ان مخالفین کی شکست کا

مچھلی والے (یونس علیہ السلام) کی طرح نہ ہو جاؤ،[۴۲] جب اُس نے پکارا تھا اور وہ غم سے بھرا ہوا تھا۔[۴۳] اگر اس کے رب کی مہربانی اُس کے شاملِ حال نہ ہو جاتی تو وہ مذموم ہو کر چٹیل میدان میں پھینک دیا جاتا۔[۴۴] آخرکار اُس کے رب نے اسے برگزیدہ فرما لیا اور اسے صالح بندوں میں شامل کر دیا۔

جب یہ کافر لوگ کلامِ نصیحت (قرآن) سنتے ہیں تو تمہیں ایسی نظروں سے دیکھتے ہیں کہ گویا تمہارے قدم اکھاڑ دیں گے،[۴۵] اور کہتے ہیں کہ یہ ضرور دیوانہ ہے، حالانکہ یہ تو سارے جہان والوں کے لیے ایک نصیحت ہے۔ ع

فیصلہ فرما دیگا۔ اُس وقت کے آنے تک جو تکلیفیں اور مصیبتیں بھی اس دین کی تبلیغ میں پیش آئیں انہیں صبر کے ساتھ برداشت کرتے چلے جاؤ۔

۴۲ یعنی یونس علیہ السلام کی طرح بے صبری سے کام نہ لو جو اپنی بے صبری ہی کی وجہ سے مچھلی کے پیٹ میں پہنچا دیے گئے تھے۔ تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد دوم، یونس، آیت ۹۸، حاشیہ ۹۹۔ جلد سوم، الانبیاء، آیات ۸۷۔۸۸۔ حواشی ۸۲ تا ۸۵۔ جلد چہارم، الصافات، آیات ۱۳۹ تا ۱۴۸، حواشی ۷۸ تا ۸۵)۔

۴۳ سورۂ انبیاء میں اس کی تفصیل یہ بیان کی گئی ہے کہ مچھلی کے پیٹ اور سمندر کی تاریکیوں میں حضرت یونس علیہ السلام نے پکارا تھا لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّىْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ "کوئی خدا نہیں تیری پاک ذات کے سوا، میں واقعی خطاوار ہوں"۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے ان کی فریاد سن لی اور ان کو غم سے نجات دی (آیات ۸۷۔۸۸)

۴۴ اس آیت کو سورۂ صافات کی آیات ۱۴۲-۱۴۶ کے ساتھ ملا کر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت حضرت یونسؑ مچھلی کے پیٹ میں ڈالے گئے تھے اس وقت تو وہ ملامت میں مبتلا تھے، لیکن جب انہوں نے اللہ کی تسبیح کی اور اپنے قصور کا اعتراف کر لیا تو اگرچہ وہ مچھلی کے پیٹ سے نکال کر بڑی سقیم حالت میں ایک چٹیل زمین پر پھینکے گئے، مگر وہ اُس وقت مذمت میں مبتلا نہ تھے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے اُس جگہ ایک بیلدار درخت اُگا دیا، تاکہ اُس کے پتے ان پر سایہ بھی کریں اور وہ اس کے پھل سے بھوک اور تشنگی بھی دور کر سکیں۔

۴۵ یہ ایسا ہی ہے جیسے ہم اردو میں کہتے ہیں کہ فلاں شخص نے اسے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے اُس کو کھا جائے گا۔ کفارِ مکہ کے اس جذبۂ غیظ و غضب کی کیفیت سورۂ بنی اسرائیل، آیات ۷۳ تا ۷۷ میں بھی بیان ہوئی ہے۔

حضرت معاویہؓ اور خلافت و ملوکیت

(۱۰)

ملک غلام علی صاحب

کیا ولی عہدی محض ایک تجویز ہے؟ محترم مدیر "البلاغ" نے یزید کی ولی عہدی پر بحث کے دوران میں اس بات پر بھی زور دیا ہے کہ محقق علماء کے نزدیک خلیفۂ وقت تنہا اپنی مرضی سے کسی کو ولی عہد بنا دے، تو یہ محض ایک تجویز ہے جسے اُمت کے اہلِ حل وعقد اُس کی وفات کے بعد قبول بھی کر سکتے ہیں اور رد بھی۔ اس سے غالباً یہ تاثر دلانا مقصود ہے کہ جب یہ چیز محض ایک ایسی تجویز و ہدایت کی حیثیت رکھتی ہے جسے رد بھی کیا جا سکتا ہے تو پھر اسے محلِ اعتراض بنانے کی کیا ضرورت ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ بہت سے معاملات ایسے ہوتے ہیں جو اپنی نظری حیثیت میں تو بالکل سادہ و سہل دکھائی دیتے ہیں لیکن ان کے عملی پہلو کے ساتھ بڑی مشکلات وابستہ ہوتی ہیں۔ یہ بات مجھے بھی تسلیم ہے کہ ولی عہدی ایک تجویز ہے بلکہ اصول و قواعدِ شرعیہ کا تقاضا ہی یہی ہے کہ یہ تجویز ہی رہے اور اس کے رد و قبول کا اختیار امتِ مسلمہ کو حاصل رہے۔ لیکن جس شخصیت کو خلیفہ ایک مرتبہ آب و تاب کے ساتھ اپنے عروجِ اقتدار کے زمانے میں سب کے سامنے پیش کر دیتا ہے اور اس کے حق میں ولی عہدی کی بیعت لے لیتا ہے، اس کو پیچھے ہٹا کر کسی دوسرے اور موزوں تر شخص کو منصبِ خلافت پر فائز کرنا امت کے لیے عملاً نہایت دشوار ہو جاتا ہے اور پوری اسلامی تاریخ میں کوئی ایک مثال بھی مشکل ہی سے ملے گی کہ کسی شخص کو ولی عہد بنائے جانے کے بعد پُرامن اور شورائی و جمہوری طریق کے مطابق اسے تبدیل کر کے کسی دوسرے اہل تر شخص کو خلیفہ بنایا گیا ہو۔ نظری اعتبار سے ولی عہد تو درکنار باقاعدہ منتخب شدہ خلیفہ بھی قابلِ عزل ہے، لیکن اگر ایک نااہل فرد ایک مرتبہ امارت پر متمکن ہو جاتا ہے تو اُسے بھی معزول کرنا اور اس کی جگہ موزوں تر فرد کو لانا سخت مشکل

بلکہ عملی طور پر محال ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امت کے محدثین اور ائمہ مجتہدین کی اکثریت نے ایسے فرد کی خلافت کو بربنائے ضرورت اور برائے انسدادِ فتنہ و فساد کی غرض سے تسلیم کر لیا ہے اور افضل کی موجودگی میں بھی مفضول کی خلافت کو جائز سمجھا ہے۔ بہرکیف ولی عہدی کی تجویز خواہ امت کے لیے واجب التعمیل ہو یا نہ ہو، یہ محض مقدس تمنا بالا طائل ہو اہیں اڑ جانے والی قرارداد نہیں ہے۔ یہ دراصل وہ خشتِ اوّل ہے جو آنے والی خلافت کے لیے بنیاد کا کام دیتی ہے۔ اگر اس میں کجی ہے تو آئندہ تعمیر کا صحیح بنیادوں پر اٹھایا جانا جوئے شیر کا لانا بلکہ موجِ خون کا سر پر سے گزارنا ہے، جیسا کہ حضرت حسینؓ اور حضرت ابن زبیرؓ کی شہادت ہمیں بتا رہی ہے۔

حضرت ابو بکرؓ نے بلاشبہ حضرت عمرؓ کو بطور جانشین تجویز کیا اور حضرت عمرؓ نے بھی مجلسِ مشاورت نامزد فرمائی۔ مگر جیسا کہ میں واضح کر چکا ہوں، انہوں نے دمِ واپسیں اور حالتِ نزع کے وقت ایسا کیا اور اپنے کسی رشتہ دار کو تجویز نہیں کیا۔ حضرت ابو بکرؓ کے الفاظ یہ تھے کہ یہ میرا آخری وقت ہے جبکہ ایک فاجر بھی تائب ہو جاتا ہے[1] اور حضرت عمرؓ کو جب آخر وقت میں امیر المومنین کہہ کر خطاب کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ آج مجھے امیر المومنین مت کہو، آج میں امیر نہیں رہا۔ ظاہر ہے کہ اُس وقت کی وصیت کو آخر اُس ولی عہدی کے تقرر سے کیا مماثلت ہو سکتی ہے جبکہ انسان بموجب ارشاد نبویؐ صحیحاً شحیحاً ہو، ہر کس و ناکس سے ولی عہدی کی بیعت لی جا رہی ہو اور اس کے لیے ایک شہر سے دوسرے شہر تک شدِّ رحال کیا جا رہا ہو؟ ظاہر ہے کہ ان دونوں میں ظاہری و معنوی دونوں لحاظ سے بڑا فرق ہے۔ حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کے معاملے میں اگرچہ عہد یا استخلاف کا لفظ حدیث کی کتابوں میں آیا ہے، لیکن ولایتِ عہد اور ولی العہد کی اصطلاح بعد میں مروّج ہوئی اور "ولی عہدی" ایک باقاعدہ استحقاقی و ترجیحی منصب بن گئی۔

---

[1] الصواعق المحرقہ ص۵۵ اور کنز العمال وغیرہ میں حضرت ابو بکرؓ کے آخری الفاظ یوں منقول ہیں: ھذا ما عھد ابی بکر فی آخر عھدہ من الدنیا خارجاً عنھا وعند اول عھدہ بالآخرۃ داخلاً فیھا حیث یومن الکافر ویوقن الفاجر ویصدق الکاذب . . . (یہ ابو بکر کی اُس گھڑی کی وصیت ہے جبکہ اس کے دنیا سے جانے کا آخری وقت اور آخرت میں داخل ہونے کا اولین وقت ہے، جبکہ کافر بھی ایمان لے آتا ہے، فاجر کو بھی یقین ہو جاتا ہے اور جھوٹا بھی سچ بولنے لگتا ہے . . .)۔ شرح فقہ اکبر ملا علی قاری ص۸۲ پر بھی معمولی تغیر لفظی کے ساتھ یہی وصیت منقول ہے۔

یزید کی اہلیتِ خلافت؟ یزید کی ولی عہدی پر بحث کرتے ہوئے مدیر "البلاغ" نے جو تنقیحات قائم کی تھیں ان میں سے پہلی یہ تھی کہ "ولی عہد بنانے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟" دوسری یہ تھی کہ "یزید خلافت کا اہل تھا یا نہیں؟" لیکن دوسری تنقیح کو بحث میں لاتے وقت انہوں نے اسے اِس عنوان میں بدل دیا ہے کہ "کیا حضرت معاویہؓ یزید کو خلافت کا اہل سمجھتے تھے؟" حقیقت یہ ہے کہ یزید کا خلافت کے لیے اہل ہونا اور حضرت معاویہؓ کا اُسے اپنی رائے میں اہل سمجھ لینا، ان دونوں باتوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ حضرت معاویہ نے اہلِ حل و عقد کی رائے معلوم کیے بغیر اپنے بیٹے کو اہل یا اہل ترین فرد سمجھ لیا ہو اور فی الواقع وہ نااہل بلکہ نااہل ترین شخص ہو؟ یہ بات پہلے واضح کی جاچکی ہے کہ جمہور اُمت کا مسلک یہ ہے کہ اگر ایک پیش رو خلیفہ کسی دوسرے کو اپنا جانشین یا ولی عہد تجویز کرنا چاہے تو اسے اُمت کے اہل ترین فرد کا انتخاب کرنا چاہیے جس میں جملہ شرائطِ خلافت بدرجۂ اتم موجود ہوں اور یہ تجویز و انتخاب ارکانِ شوریٰ کے مشورے سے ہونا چاہیے۔ اس کے بعد ہی یہ امر متحقق ہوسکتا ہے کہ خلیفہ جس شخص کو نامزد کرنا چاہتا ہے اور جسے وہ جانشینی کا اہل سمجھ رہا ہے، وہ اُمت اور اس کے مجاز نمائندوں کے نزدیک بھی اہل ہے یا نہیں۔ اگر خلیفہ کا تجویز کردہ شخص اس کا بیٹا ہو، تب تو اربابِ حل و عقد کی منظوری اور بھی زیادہ ضروری ہے۔ اور وہ اہلِ حل و عقد بھی شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے بقول مستجمعینِ شروطِ خلافت، یعنی ایسے افراد ہونے چاہییں جو اپنے اندر پوری طرح شرائطِ خلافت کو جمع کیے ہوئے ہوں۔ اگر ایسا نہ ہو تو اس بات کا قوی خدشہ ہے کہ بیٹے کی محبت باپ پر غالب آجائے اور اس کی قوتِ فیصلہ اور صوابدید کو متاثر کردے۔ اس میں کسی کی ذات پر یا نیت پر حملے کا کوئی سوال نہیں۔ کیا خدا کی کتاب اور اس کے نبیؐ کے ارشادات اس پر بار بار شہادت نہیں دیتے کہ اولاد ہمارے لیے آزمائش ہے، وہ ہمارے لیے مزین کردی گئی ہے اور وہ ہمارے لیے خطرناک دشمن ثابت ہوسکتی ہے؟ کیا حضرت حاطبؓ بن ابی بلتعہ ایک مخلص مومن اور بدری صحابی ہونے کے باوجود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا انتہائی نازک اور اہم جنگی راز مشرکین پر محض اس لیے نہیں فاش کر بیٹھے تھے کہ ان کے اہل و عیال کو کوئی گزند نہ پہنچے؟

حق بات یہ ہے کہ یزید کا خلافت یا ولی عہدی کے لیے اہل یا اہل تر ہونا تو درکنار، اس کی نااہلیت اور اس کا فسق و فجور ایک ایسی کھلی ہوئی تاریخی حقیقت ہے جس کا انکار محض مکابرہ ہے۔ اگر وہ خلیفہ کا بیٹا نہ ہوتا

تو وہ آخری شخص ہو سکتا تھا جس کی جانب کسی کی نگہ انتخاب اٹھ سکتی تھی۔ لیکن خوش قسمتی یا بد قسمتی سے چونکہ وہ خلیفہ کا بیٹا تھا اور خلیفہ نے اُسے اپنی نظر میں اہل سمجھ کر چن لیا تو اب اس خلفِ رشید کا فجور و تقویٰ گوناگوں بحث کا موضوع بن گیا۔ بعض نے کہا کہ وہ تو بڑا عابد و زاہد اور لائق و فائق تھا، اس کی عیاشی و بداعمالی کی داستانیں محض افسانے ہیں۔ بعض نے فرمایا کہ اس کے فسق و فجور میں تو شک نہیں مگر وہ امیر معاویہؓ سے آخر دم تک مخفی رہ گیا یا رکھا گیا۔ بعض نے کہا کہ ولی عہدی کے وقت اُسے والدِ محترم نے یا دوسرے بہی خواہوں نے سرزنش کی اور وہ سُدھر گیا۔ اب مولانا عثمانی صاحب نے فسق و فجور اور صلاح و تقویٰ دونوں کے مابین یوں تطبیق و توضیح فرما دی کہ یزید ویسے تو بہت اچھا تھا مگر سانحۂ کربلا نے اس کی شہرت کو داغدار کر دیا۔ گویا کہ حضرت حسینؓ اور آپ کے بہتر ساتھیوں کا سنگدلانہ قتل شاید کسی گاڑی کا حادثہ تھا جو کسی بڑے ــــ نیک دل اور بھلے مانس ڈرائیور کے ساتھ محض سوءِ اتفاق سے پیش آگیا اور اس کے آگے پیچھے اور گرد و پیش کی فضا میں کوئی ایسے سلسلۂ اسباب و واقعات کا وجود تک نہ تھا جس کا یزید ذمہ دار یا بانی ہو، اور یزید کے خصائل و سوابق سے جس کا کوئی واسطہ ہو۔ اگر یہی بات ہے تو پھر آپ بھی کھل کر کیوں نہیں کہہ دیتے کہ حضرت حسینؓ اور حضرت ابن زبیرؓ کی روش ــــ اسے خروج کہیے، عدمِ بیعت کہیے، فسخِ بیعت کہیے یا بغاوت و انتشار پسندی کہیے ــــ بالکل بے جواز اور قابلِ مواخذہ تھی؛ جب یزید صالح، طالبِ خیر اور نیکوکار تھا اور واقعۂ کربلا تک اس میں یہ سارے اوصاف اور نجابت و صلاحیت پائی جاتی تھی، تو پھر مجرد واقعہ کربلا سے اُس کی تصویر آخر کیوں مکروہ اور اس کی شہرت کیوں مجروح ہونے لگی۔ پھر تو سارا قصور حسینؓ ہی کا تھا کہ انہوں نے یزید کے دستِ حق پرست پر فوراً بیعت نہ کر لی اور وہ راستہ اختیار کیا جس نے انہیں صحرائے کرب و بلا جا پہنچایا۔ اہلیتِ یزید کے حق میں اس استدلال کے بعد محمود عباسی صاحب اور اپنے موقف کے مابین جو باریک فرق آپ پیدا کر رہے ہیں، اس کی کوئی حقیقت و اہمیت باقی نہیں رہتی۔

یزید کی صالحیت: یزید کی صلاحیت و صالحیت کے متعلق جو دلائل و شواہد "البلاغ" میں دیئے گئے ہیں وہ بھی قابلِ دید و قابلِ داد ہیں۔ سب سے پہلے یہ بیان کیا گیا ہے کہ جب حضرت سعید بن عثمانؓ نے یزید کی ولی عہدی پر اعتراض کیا تو حضرت معاویہؓ نے فرمایا کہ اگر فلاں میدان تم جیسے آدمیوں سے بھر جائے

تو بھی یزید تم سے بہتر اور زیادہ محبوب ہوگا۔ اب قطع نظر اس سے کہ یہ باپ کا بیٹے کے حق میں بیان ہے اس میں حضرت معاویہؓ نے یہ بالکل واضح نہیں فرمایا کہ وہ کیا وجوہ و خصائص ہیں جن کی بنا پر یزید حضرت سعید سے زیادہ محبوب اور بہتر تھا۔ اس کے بغیر آخر کیسے آپ کا یہ ارشاد اس معاملے میں فیصلہ کن ہو سکتا ہے کہ آیا یزید فی الواقع اہلِ خلافت تھا۔ بیٹا باپ کو محبوب تو ہوتا ہی ہے۔

اس کے بعد عثمانی صاحب نے امیر معاویہؓ کی ایک دعا نقل کی ہے۔ اس میں بلاشبہ آپ کی یہ خواہش مذکور ہے کہ اگر یزید اس منصب کا اہل ہے تو اللہ اس کی ولایت کو پورا فرما دے، ورنہ اس کی روح قبض کرے۔ لیکن ان دعائیہ کلمات سے بھی یزید کی فضیلت و اہلیت ثابت نہیں ہوتی بلکہ صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ امیر معاویہؓ اپنی رائے میں نیک نیتی کے ساتھ اُسے ایسا سمجھتے تھے، لیکن یہ رائے جیسا کہ عرض کیا جا چکا غلطی اور مبالغے کے احتمال سے خالی نہیں ہو سکتی۔ بلاذریؒ کا جو حوالہ نقل کیا گیا ہے، اس میں حضرت ابن عباسؓ کا محض یہ قول منقول ہے کہ امیر معاویہؓ کا بیٹا" ان کے صالح اہل خانہ میں سے ہے۔" میری سمجھ میں نہ آسکا کہ اس میں سے یزید کے فضائل و مناقب کہاں سے نکل آئے؟ کسی شخص کے مِن صَالِحِی اَھلِہ ہونے سے یہ کیسے لازم آتا ہے کہ وہ پوری اُمت کی امامت و قیادت کے لیے بھی موزوں ہے؟ پھر یہاں اصلح کا صیغۂ تفضیل بھی نہیں استعمال ہوا، گویا کہ مطلب یہ ہے کہ اس گھر میں جو اچھے لوگ ہیں، ان میں سے ایک یزید بھی ہے۔ اس کے بعد حضرت محمد بن حنفیہ کا یہ ارشاد نقل کیا گیا ہے کہ میں نے یزید کو نماز کا پابند اور خیر کا طالب پایا۔ وہ فقہ کے مسائل پوچھتا ہے اور سنت کا پابند ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ محمد بن حنفیہ تھوڑا عرصہ جا کر شام میں یزید کے پاس ٹھہرے تھے اور جو کچھ آپ نے دیکھا وہ بیان کر دیا۔ لیکن بعض دوسرے حضرات، جن میں صحابۂ کرام بھی شامل ہیں اور جو یزید کے حالات سے زیادہ واقف تھے، انہوں نے جو کچھ یزید کے بارے میں فرمایا ہے وہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ مثلاً حضرت مقدامؓ بن معدیکرب نے جو کچھ حضرت معاویہؓ کے سامنے فرمایا تھا، اُسے میں مسند احمد اور سُنن ابی داؤد کے حوالے سے پہلے نقل کر چکا ہوں۔ آئندہ کسی موقع پر انشاء اللہ میں پوری تفصیل دوں گا۔ یہاں میں صرف اتنی بات پر اکتفا کرتا ہوں کہ نماز پڑھنا اور فقہ کے مسائل پوچھنا آج کل کے زمانے میں تو بلاشبہ بڑی نیکی کی علامت ہے، لیکن اُس زمانے کا بُرے سے بُرا شخص بھی ان اعمال سے خالی نہ تھا۔ آخر عبدالملک بن مروان اور اس کا گورنر حجاج بھی تو دونوں نماز روزے

کے پابند تھے اور فقہ کے مسائل پوچھتے بلکہ بتاتے تھے، حالانکہ اسی حجاج کے متعلق امام ترمذی، سُنن، کتاب الفتن میں صحیح سند کے ساتھ ہشام بن حسان سے روایت کرتے ہیں کہ حجاج نے ایک لاکھ انسانوں کو مُشکیں کس کے قتل کیا تھا۔

مولانا عثمانی صاحب نے حضرت محمد بن حنفیہ کا قول تو ابن کثیرؒ سے نقل کر دیا ہے لیکن او رمتعدد اقوال جو یزید کے فاسق ہونے پر دلالت کرتے ہیں، ان سے صرفِ نظر کر لیا ہے اور اسی البدایہ میں ابن کثیرؒ نے (جلد ۸ ص ۲۳۲) پر خود اپنی جو رائے بیان کی ہے اُسے بھی قابلِ اعتناء نہیں سمجھا۔ وہ فرماتے ہیں:

قلت یزید بن معاویۃ اکثر ما نقم علیہ فی عملہ شرب الخمر واتیان بعض الفواحش فاما قتل الحسین فانہ کما قال جدہ ابو سفیان یوم احد لم یامر بذالک ولم یسؤہ	مَیں کہتا ہوں کہ یزید بن معاویہؓ کے اعمال میں اکثر جو چیز ناپسند کی گئی ہے وہ اس کی شراب نوشی اور ارتکاب فواحش تھی۔ جہاں تک حضرت حسینؓ کے قتل کا تعلق ہے تو یہ معاملہ بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ اس کے دادا ابو سفیان نے اُحد کے دن کہا تھا کہ مسلمانوں کے قتل اور مُثلہ کا حکم اس نے نہیں دیا، مگر جو کچھ ہُوا وہ اُس کے لیے باعثِ افسوس بھی نہیں ہے۔

پھر عثمانی صاحب نے یزید کی شہرت کو خراب کرنے والا واقعہ صرف قتلِ حسین ہی بیان کیا ہے معلوم نہیں اس کے بعد واقعۂ حرّہ میں جو کچھ ہُوا، اس کا بھی فسقِ یزید سے کچھ تعلق مولانا عثمانی صاحب کے خیال میں ہے یا نہیں یا اس میں بھی وہ یزید کو معذور اور حق بجانب ہی سمجھتے ہیں۔ اس واقعہ پر ابن کثیرؒ نے اسی جلد کے ص ۲۲۳ پر ان الفاظ میں تبصرہ کیا ہے:

وقد اخطأ یزید خطأ فاحشا فی قولہ لمسلم بن عقبۃ ان یبیح المدینۃ ثلاثۃ ایام و ھذا خطأ کبیر فاحش مع ما انضم الی ذالک من قتل خلق من الصحابۃ وابنائھم وقد	یزید نے مسلم بن عُقبہ کو یہ حکم دے کر خطائے عظیم کا ارتکاب کیا کہ وہ مدینہ کو تین دن کے لیے مباح قرار دیدے۔ یہ بہت بڑی فاحش غلطی تھی بالخصوص جبکہ اس طرح صحابہ کرام اور ان کی اولاد کی بڑی تعداد قتل کی گئی پہلے بیان

تقدم انه قتل الحسين واصحابه على يدى
ابن زياد وقد وقع فى هذه الثلاثة ايام
من المفاسد العظيمة فى المدينة النبوية
مالا يحد ولا يوصف مما لا يعلمه الا الله
عز وجل وقد اراد بارسال مسلم بن عقبة
توطيد سلطانه وملكه ودوام ايامه من
غير منازع فعاقبه الله بنقيض قصده و
حال بينه وبين ما يشتهيه فقصمه الله
قاصم الجبابرة واخذه اخذ عزيز مقتدر
وَكَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَآ اَخَذَ الْقُرٰى وَهِيَ
ظَالِمَةٌ ۔ اِنَّ اَخْذَهٗٓ اَلِيْمٌ شَدِيْدٌ (الآیہ)

ہو چکا کہ اسی یزید نے حضرت حسینؓ اور آپ کے رفقاء کو ابن زیادؔ کے ہاتھوں قتل کرایا۔ واقعۂ حرہ کے ان تین دنوں میں مدینۂ نبویہ میں ایسے مفاسد عظیمہ رونما ہوئے جو بے حد و حساب اور ناقابلِ بیان ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہی انہیں جانتا ہے۔ یزید نے چاہا تھا کہ مسلم بن عقبہ کو اس حرکت پر مامور کر کے اپنی بادشاہی کو مضبوط کرے، حکومت کو دوام عطا کرے اور کوئی اس کا مدِ مقابل نہ رہے پس اللہ نے اس کے عزائم کو ناکام بنا دیا، اُسے سزا دی اور اس کی خواہشات کے راستے میں حائل ہو گیا۔ پھر اللہ نے اُسے ایسا چکنا چور کیا جیسا کہ وہ جابروں اور ظالموں کو کرتا ہے اور اُسے ایسا پکڑا جیسا کہ زبردست اور طاقتور پکڑتا ہے " اور تیرے رب کی پکڑ ایسی ہی ہوتی ہے جب وہ آبادیوں کو گرفت میں لیتا ہے جبکہ وہ ظلم ڈھاتی ہیں۔ یقیناً اس کی گرفت المناک اور سخت ہوتی ہے۔"

مولانا محمد تقی صاحب بار بار یہ کہتے ہیں کہ یزید کا فسق و فجور کسی قابلِ اعتماد روایت سے ثابت نہیں اور حضرت معاویہؓ نے اُسے محبتِ پدری کی بنا پر ولی عہد نہیں بنایا تھا۔ حالانکہ ابن خلدون جنہوں نے اس ولی عہدی کو جائز و صحیح ثابت کرنے کی پوری کوشش کی ہے، انہوں نے بھی اس بحث کے دوران میں جابجا فسقِ یزید کو برملا تسلیم کیا ہے، بلکہ ان لوگوں پر سخت نکیر کی ہے جو اسے فاسق کے بجائے عادل مان کر امام حسینؓ کے موقف کو مجروح و مشکوک بناتے ہیں۔ باقی جہاں تک جذبۂ محبت کے کارفرما ہونے کا تعلق ہے، اس کا ثبوت ابن کثیر کی اس عبارت سے مل رہا ہے جو خود مدیرِ "البلاغ" نے اس بحث میں البدایہ، ج ۸، ص ۸۰ سے نقل کی ہے کہ امیر معاویہؓ کی رائے یہ تھی کہ "یزید خلافت کا اہل ہے اور یہ رائے باپ بیٹے کی

شدید محبت کی وجہ سے تھی، نیز اس لیے تھی کہ وہ یزید میں دنیوی نجابت اور شاہزادوں کی سی خصوصیات، فنونِ جنگ سے واقفیت اور انتظامِ سلطنت کی صلاحیت دیکھتے تھے۔" لیکن اس بات کا آخر کون دعویٰ کر سکتا ہے کہ خلیفۂ وقت کا بیٹا ہونے کے سوا دیگر صفاتِ مذکورہ رکھنے والا کوئی دوسرا شخص موجود نہ تھا۔

ابن حجرؒ مکی کے اقوال | یزید اور ولی عہدیِ یزید کے مسئلے پر جو کچھ علمائے سلف نے لکھا ہے، میں ان میں سے اب امام ابن حجر ہیثمی مکی کے چند اقتباسات پیش کرنا چاہتا ہوں جو ائمۂ شافعیہ میں بلند مقام رکھتے ہیں۔ ان کی دو کتابیں "الصواعق المحرقہؒ فی الرد علی اہل البدعۃ والزندقہ" اور "تطہیر الجنان واللسان عن الخطور والتفوہ بثلب سیدنا معاویۃ بن ابی سفیان" بہت مشہور ہیں۔ مدیرِ "البلاغ" نے اپنے سلسلۂ بحث میں ان کے حوالے جابجا دیتے ہیں اور ایک مقام پر یہ صراحت بھی ضروری سمجھی ہے کہ "اس حوالے کے لیے ہم محترم جناب مولانا محمد یوسف صاحب خطیب جامع اہلِ حدیث کے شکر گزار ہیں۔" عدالتِ صحابہ کی بحث میں ابن حجرؒ کی جو عبارتیں نقل کی گئی ہیں، ان کے متعلق تو انشاء اللہ آگے چل کر میں عرض کروں گا، یہاں میں اتنی بات واضح کرنا مناسب سمجھتا ہوں کہ مذکورۂ بالا دونوں کتابیں اہلِ سنت کا عقیدہ و مسلک خوارج و اہلِ تشیع کے بالمقابل پیش کرتی ہیں۔ پہلی کتاب میں خلفائے راشدین کے مناقب و مآثر درج کیے گئے ہیں اور ان کے خلاف اعتراضات کا رد کیا گیا ہے اور دوسری کتاب، جیسا کہ اس کا نام ہی بتا رہا ہے حضرت معاویہؓ کے فضائل پر مشتمل ہے اور مختصرات میں یہ ایک اہم تالیف ہے جو امیر معاویہؓ کے دفاع میں لکھی گئی ہے۔ اب اسی کتاب تطہیر الجنان کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

لہ اس کتاب کا ایک حوالہ میں نے گزشتہ ترجمان میں دیا تھا جس سے ثابت ہوتا تھا کہ یزید نے حضرت حسنؓ کو زہر دلوایا تھا، مگر عبارت نقل نہ ہو سکی۔ الفاظ یہ ہیں: وکان سبب موتہ ان زوجتہ جعدۃ بنت الاشعث بن قیس الکندی دس الیھا یزید ان تسمہ و یتزوجھا و بذل لھا مائۃ الف درھم۔ ففعلت (الصواعق المحرقہ ص ۸۶ مطبعہ میمنیہ، مصر ۱۳۰۸ھ) "حضرت حسنؓ کی موت کا سبب یہ ہوا کہ یزید نے ان کی بیوی جعدہ بنت الاشعث بن قیس کندی سے سازش کی کہ وہ ان کو زہر دیدے اور وعدہ کیا کہ وہ اس سے شادی کرلے گا اور اسے ایک لاکھ درہم دیئے۔ چنانچہ اس نے زہر دے دیا۔"

مزید محبته لیزید اعمت علیه طریق الهدی
واوقعت الناس بعده مع ذلك الفاسق المارق
فی الردی، لکنه قضاء انحتم و قدرا نبرم۔
فسلب عقله الکامل وعمله الشامل و
دهاء الذی کان یُضرب به المثل وزین
له من یزید حسن العمل وعدم
الانحراف والخلل کل ذلك لما اشار
الیه الصادق المصدوق صلی الله علیه
وسلم انه اذا اراد الله انفاذ امره
فسلب ذوی العقول عقولهم حتی
ینفذ ما اراده تعالی - فمعاویة معذور
فیما وقع فیه لیزید لانه لم یثبت عنده
نقص فیه بل کان یزید یدس علی ابیه
من یحسن له حاله حتی اعتقد انه اولی
من ابناء بقیة الصحابة کلهم فقدمه
علیهم مع ان تلك الاولویة التی تخیلها
ممن سلط علیه لیحسنها له اختیاره للناس
عن ذالك انما هو لظن انهم انما کرهوا
تولیته لغیر فسقه من حسد او نحوه
(تطہیر الجنان صفحہ مطبعۃ میمنیہ مصر، ۱۳۰۷ھ)

امیر معاویہؓ پر یزید کے غلبہ محبت نے طریق ہدایت گم کر دیا اور اس فاسق و بے دین کے ساتھ دوسرے لوگوں کو بھی ہلاکت میں ڈال دیا لیکن قضاء و قدر کی جو بات قطعی تھی وہ پوری ہو کر رہی۔ پس آپ کی وہ ذہنی و عملی صلاحیت اور ضرب المثل مدبرانہ قابلیت سلب کرلی گئی اور اُن کے لیے یہ بات مزین کر دی گئی کہ یزید نیکوکار اور انحراف و خلل سے پاک ہے۔ یہ سب کچھ اس ارشاد نبوی کے مطابق ہوا جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ فرما دیا تھا کہ جب اللہ کسی امر کو نافذ کرنا چاہتا ہے تو عقل والوں کی عقل چھین جاتی ہے حتی کہ اللہ اپنے ارادے کا نفاذ فرما دیتا ہے۔ پس معاویہؓ نے جو کچھ یزید کے لیے کیا وہ اس میں معذور تھے کیونکہ ان کے نزدیک اس میں کوئی نقص ثابت نہ تھا۔ بلکہ یزید اپنے والد کے پاس ایسے لوگوں کو گھسا دیتا تھا جو ان کے سامنے اُس کے کوائف کو اچھا بنا کر پیش کرتے تھے، یہاں تک کہ وہ یقین کرنے لگے کہ یزید صحابہ کرام کی موجود اولاد سے افضل ہے۔ پس انہوں نے اس فضیلت کی تصریح کرتے ہوئے یزید کو ان سب پر ترجیح دی اور یہ فضیلت کا تخیل ان لوگوں کا پیدا کردہ تھا جو امیر معاویہ پر مسلط کیے گئے تھے تاکہ وہ یزید کی اس افضلیت کو ان کے لیے خوشنما بنائیں۔ امیر معاویہ کا یزید کو ولی عہد منتخب کرنا اس بنا پر تھا کہ ان کے گمان میں لوگ یزید کی ولی عہدی کو فسق کی وجہ سے نہیں بلکہ حسد وغیرہ کے باعث ناپسند کرتے تھے۔

اب ایک طرف یزید کی وہ تصویر رکھیے جو عثمانی صاحب پیش کر رہے ہیں کہ اس کی سیرت واقعۂ کربلا سے پہلے بالکل بے داغ تھی اور وہ ہر طرح خلافت کا اہل تھا، اور دوسری طرف ابن حُجر کو دیکھیے کہ وہ یزید کی بے دینی اور مکاری و پُرکاری اور امیر معاویہؓ کی مغلوبیت اور سادگی کو کس رنگ میں پیش کر رہے ہیں؟

اسی سلسلے میں اسی کتاب کے صفحہ ۱۲۰ کا ایک اقتباس بھی دیکھیے:

الصحابة رضي الله عنهم كلهم عدول مجتهدون على الصواب الذي لا يجوز لاحد ان يعتقد غيره. لكنهم مع ذالك قد يقع من احدهم مما لا يليق بمقامه فيعتذر له بالنسبة اليه كاستخلاف معاوية يزيد. فان مزيد محبة الولد زين له رؤيته كماله واعمى عنه رؤية عيوبه التي هي اوضح من الشمس في رابعة النهار. فهذا بحسب كمال معاوية زلة يغفر الله له ولا يجوز التاسي به فيها فمن تاسى به فيها كب على منخريه في النار.

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سب کے سب ایسے عادل، مجتہد اور راستی پر ہیں کہ کسی کے لیے جائز نہیں کہ وہ اس کے سوا کوئی اور عقیدہ رکھے لیکن اس کے باوجود ان سے ایسے عمل کا صدور ہو سکتا ہے جو ان کے مقام کے لائق نہ ہو کہ اس مقام کی نسبت سے اس پر عذر پیش کیا جا سکے، مثلاً معاویہؓ کا یزید کو جانشین بنانا، یقیناً بیٹے کی محبت کی زیادتی نے اس کے کمال کو ان کے لیے مزین بنا دیا اور اس کے وہ عیوب ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے جو دن چڑھے سورج سے بھی زیادہ تر واضح تھے۔ امیر معاویہؓ کے کمال کی نسبت سے یہ ایک لغزش ہے جسے اللہ بخش دیگا۔ لیکن اس معاملہ میں ان کی تقلید جائز نہیں۔ پس جو ان کی اس میں پیروی کرے گا وہ اوندھے منہ دوزخ میں جائیگا۔

اسی کتاب کے صفحہ ۶۶ پر ابن حجر فرماتے ہیں:

انا فرقنا بينه وبين ولده واعطينا كلا ما يستحقه لانا متعبدون بالادلة من غير عصبية ولا علة. ولو كان الامر بالتعصب والمحاباة لما خالفنا معاوية في ولده الذي

ہم نے امیر معاویہ اور ان کے بیٹے کے درمیان فرق ملحوظ رکھا ہے اور دونوں کے متعلق وہی بات کہی ہے جس کے وہ حقدار تھے۔ کیونکہ ہم کسی تعصب و ناخوشی کے بغیر فقط دلائل کے پیرو ہیں۔ اگر ہمارا معاملہ تعصب اور

قال فيه لولا هوای فيه لرأيت قصدی ای لهديت الى اوسط الامور واعدلها فی استخلاف غيره۔

جانبداری پر مبنی ہوتا تو ہم معاویہؓ کے لڑکے کے بارے میں ان سے اختلاف نہ کرتے جس کے متعلق انہوں نے فرمایا تھا اگر مجھے اس سے محبت نہ ہوتی تو مَیں راہِ اعتدال پالیتا یعنی مَیں یزید کے بجائے کسی دوسرے کو جانشین بناکر زیادہ بہتر اور منصفانہ طریقہ اختیار کرتا۔

انہی امام ابن حجرؒ کی بعض تحریروں کے بل پر مدیرؔ البلاغ، نے عدالتِ صحابہ کے متعلق جو اختراعی نظریہ وعقیدہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے، اس پر یہاں قبل از وقت بحث کرنا میرے لیے ممکن نہیں ہے، لیکن یزید کی ولی عہدی کے جواز پر اجماعِ امّت کا جو فتویٰ مدیر موصوف دے رہے ہیں، اُسے سامنے رکھتے ہوتے مَیں فقط یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ وہ ابن حجرؒ کے متعلق کیا ارشاد فرماتے ہیں جو یہ کہہ رہے ہیں کہ امیر معاویہ نے فاسق ومارق بیٹے کی محبت میں آکر امّت کو تباہی سے دوچار کیا اور جو شخص بعد میں ایسا کرے گا وہ منہ کے بل آگ میں گرے گا؟ پھر اس کے ساتھ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ابنِ حجر کوئی مجرّد تاریخی بحث نہیں کر رہے ہیں بلکہ ان کی کتاب کا موضوع ہی یہ ہے کہ حضرت معاویہؓ کے مناقب کا اثبات اور آپ کے مثالب کا ابطال کیا جاتے اور معترضین کے شبہات واعتراضات سے لوگوں کے دلوں اور ان کی زبانوں کو پاک کیا جاتے۔اس کے باوجود مولانا مودودی نے جو کچھ لکھا ہے اور جس پیرائے میں لکھا ہے۔اس سے شدید تر اور واضح تر انداز میں ابن حجرؒ نے لکھا ہے۔اس کے صرف چند نمونے مَیں نے نقل کیے ہیں۔اس کے باوجود مولانا عثمانی صاحب، مولانا مودودی کی جانب روئے سخن کرتے ہوتے فرماتے ہیں کہ جو شخص یہ کہتا ہے کہ امیر معاویہؓ نے یزید کو بیٹا ہونے کی وجہ سے خلافت کے لیے نامزد کیا تھا وہ تحکم وظلم کا ارتکاب کرتا ہے!

یزید کی مغفوریت بعض حضرات اس حدیث سے بھی یزید کے مناقب ومحامد ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو صحیح بخاری اور دیگر کتب میں غزوۂ روم کے سلسلے میں وارد ہوئی ہے اور جس میں شرکائے غزوہ کو مغفرت کی بشارت دی گئی ہے۔بعض قارئین نے مجھ سے تقاضا کیا ہے کہ اس خوشخبری کے مفہوم پر بھی روشنی ڈالی جائے۔ میرے لیے اس موضوع پر یہاں تفصیلی بحث ممکن نہیں ہے۔اگر اللہ نے کبھی مہلت عطا فرمائی تو پوری شرح و

بسلہ کے ساتھ میں بعض متعلقہ مباحث پر گفتگو کروں گا۔ یہاں میں سرِدست شاہ ولی اللہ صاحب کی شرح تراجم بخاری کا ایک اقتباس نقل کرتا ہوں جو مختصر ہونے کے باوجود جامع اور فیصلہ کن حیثیت رکھتا ہے۔ کتاب الجہاد باب ماقیل فی قتال الروم کے زیرِ عنوان فرماتے ہیں:

قوله مغفور لهم تمسك بعض الناس بهذا الحديث في نجاة يزيد لانه كان من جملة هذا الجيش الثاني بل كان رأسهم رئيسهم على ما يشهد به التواريخ والصحيح انه لا يثبت بهذا الحديث الا كونه مغفوراً له ما تقدم من ذنبه على هذه الغزوة لان الجهاد من الكفارات وشأن الكفارات ازالة آثار الذنوب السابقة عليها لا الواقعة بعدها نعم لو كان مع هذا الكلام انه مغفور له الى يوم القيامة لدل على نجاته وليس فليس بل امره مفوض الى الله تعالى فيما ارتكبه من القبائح بعد هذه الغزوة من قتل الحسين عليه السلام وتخريب المدينة والاصرار على شرب الخمر ان شاء عفا عنه وان شاء عذبه كما هو مطرد في حق سائر العصاة على ان الاحاديث الواردة في شان من استخف بالعترة الطاهرة و الملحد في الحرم والمبدل للسنة تبقى مخصصات

"مغفور لھم" کے ارشادِ نبوی کو دلیل بنا کر بعض لوگوں نے یزید کی نجات پر استدلال کیا ہے کیونکہ وہ بھی اس دوسرے لشکر میں شامل بلکہ ان کا سالار تھا جیسا کہ تاریخ گواہی دیتی ہے۔ لیکن صحیح بات یہ ہے کہ اس حدیث سے صرف اتنی بات ثابت ہوتی ہے کہ اس غزوے سے پہلے کے گناہ جو یزید نے کیے تھے، وہ بخشے گئے۔ کیونکہ جہاد کفارات میں سے ہے اور کفارات کا معاملہ یہ ہے کہ ان سے پہلے کے گناہ زائل ہوتے ہیں، نہ کہ بعد کے۔ ہاں، اگر آنحضورؐ کے کلام کے ساتھ یہ الفاظ بھی ہوتے کہ اس کی مغفرت قیامت کے دن تک ہے، تب وہ اس کی نجات پر دلالت کرتے اور اگر یہ الفاظ نہیں ہیں تو نجات پر دلالت بھی نہیں ہے بلکہ اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے اس غزوے کے بعد جن قبائح کا ارتکاب اس نے کیا، یعنی حسین رضی اللہ عنہ کو قتل کیا، مدینہ منورہ کو تباہ کیا اور شراب نوشی پر اصرار کیا ان پر اگر اللہ چاہے تو معاف کر دے اور چاہے تو عذاب دے جیسا کہ تمام عاصیوں کے بارے میں طے شدہ ہے۔ اور اگر یزید کی

شمولیت تمام گناہوں میں مان لی جائے تو تمام گنہگاروں لھذا العموم لو فرض شمولہ لجمیع الذنوب
کے متعلق جو عمومی اصول طے ہے (کہ ان کی معافی اور سزا (شرح تراجم ابواب صحیح البخاری ، دائرۃ المعارف
دونوں کا امکان ہے)، یزید کے معاملے میں وہ عموم العثمانیہ ۱۳۶۸ھ)
بھی باقی نہ رہے گا بلکہ اس میں وہ احادیث تحدید وتخصیص پیدا کر دیں گی جن میں اہلِ بیت کا استخفاف کرنے والوں، حرم میں الحاد کرنے والوں اور سنت میں ردّو بدل کرنے والوں کو وعید ہے۔

شاہ صاحبؒ کا ارشاد اپنی جگہ واضح ہے۔ بدری صحابہ کرام کی فضیلت و منقبت میں جو نصوصِ کتاب و سنت وارد ہیں، وہ کسی سے مخفی نہیں، حتیٰ کہ ان کے حق میں فرمایا گیا کہ وہ جو چاہیں کرتے رہیں، ان پر کوئی گرفت نہیں۔ اس کے باوجود ان پر اجرائے حدود ہوا۔ ان میں سے (ثعلبہ) مدینہ چھوڑ کر دیہات میں آباد ہوتے اور صلوٰۃ جمعہ اور زکوٰۃ کی ادائیگی میں تساہل کیا، پھر نادم ہوئے، آکر زکوٰۃ پیش کی مگر اسے ردّ کر دیا گیا۔ بعد میں خلفائے راشدین نے بھی اس کی زکوٰۃ قبول کرنے سے انکار کر دیا، یہاں تک کہ اس کا انتقال اسی حال میں ہوا۔

مزید ایک بات جس کی طرف اشارہ کر دینا مناسب ہے، وہ یہ ہے کہ جو لوگ تاریخی روایات کا شدت سے انکار کرتے ہیں وہ بھی اس غزوے والی حدیث کو یزید پر منطبق کرتے ہوئے تاریخ کا سہارا لینے پر مجبور ہیں کیونکہ حدیث میں تو یزید کا ذکرِ خیر نہیں ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا نام لے کر بشارت نہیں فرمائی، مزید تفصیلات تاریخ ہی بتاتی ہے اور جہاں تک تاریخ کا تعلق ہے اس میں کچھ اختلاف بھی منقول ہے کہ یزید لشکر میں تھا یا نہیں، تھا تو پہلے لشکر میں تھا یا دوسرے میں، اور کس حیثیت سے گیا تھا یا بھیجا گیا تھا؟ خیر، یہ بحث تو اپنی جگہ پر ہے، مجھے جو کچھ کہنا تھا وہ یہ کہ جو حامیانِ یزید تاریخ کو دریا بُرد کرنا چاہتے ہیں، انہیں خسارے کا یہ پہلو بھی مدِنظر رکھنا چاہیے کہ کتبِ تاریخ کو کالے پانی میں غرق کر دینے کے بعد مجرد قرآن و حدیث سے یزید کے فضائل و مناقب کا استخراج بڑا دشوار ہو جائے گا، کتاب و سنت ذکرِ یزید سے پاک ہے۔

مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کے ارشادات اب میں آخر میں چاہتا ہوں کہ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کی

کتاب "شہید کربلا" کے چند اقتباس بھی نقل کر دوں۔ مولانا موصوف کے فاضل فرزند کی نظر سے یہ کتاب ضرور گزر چکی ہوگی مگر دوسرے قارئین نے ممکن ہے کہ اس کا مطالعہ نہ کیا ہو۔ جناب مفتی صاحب کی عبارات مع عنوانات درج ذیل ہیں :

"خلافتِ اسلامیہ پر ایک حادثۂ عظیمہ"[1]

"خلافت کا سلسلہ جب امیر معاویہؓ پر پہنچتا ہے تو خلافتِ راشدہ کا رنگ نہیں رہتا، ملوکیت کی صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ معاویہؓ کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ زمانہ سخت فتنہ کا ہے، آپ اپنے بعد کے لیے کوئی ایسا انتظام کریں کہ مسلمانوں میں پھر تلوار نہ نکلے اور خلافتِ اسلامیہ پارہ پارہ ہونے سے بچ جائے۔ باقتضاء حالات یہاں تک کوئی نامعقول یا غیر شرعی بات بھی نہ تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی آپ کے بیٹے یزید کا نام مابعد کی خلافت کے لیے پیش کیا جاتا ہے۔ کوفہ سے چالیس خوشامد پسند آتے ہیں یا بھیجے جاتے ہیں کہ معاویہؓ سے اس کی درخواست کریں کہ آپ کے بعد آپ کے بیٹے یزید سے زیادہ کوئی قابل اور ملکی سیاست کا ماہر نظر نہیں آتا، اس کے لیے بیعتِ خلافت لی جائے حضرت معاویہؓ کو شروع میں کچھ تامل بھی ہوتا ہے، اپنے مخصوصین سے مشورہ کرتے ہیں۔ ان میں اختلاف ہوتا ہے، کوئی موافقت میں رائے دیتا ہے، کوئی مخالفت میں۔ یزید کا فسق و فجور بھی اُس وقت تک نہیں کھلا تھا۔ بالآخر بیعتِ یزید کا قصد کر لیا جاتا ہے اور اسلام پر یہ پہلا حادثۂ عظیم ہے کہ خلافتِ نبوت ملوکیت میں منتقل ہو جاتی ہے۔"

"اسلام پر بیعتِ یزید کا حادثہ"

"شام و عراق میں معلوم نہیں کس کس طرح خوشامد پسند لوگوں نے یزید کے لیے بیعت کا چرچا کیا اور یہ شہرت دی گئی کہ شام و عراق، کوفہ و بصرہ یزید کی بیعت پر متفق ہو گئے۔ اب حجاز کی طرف رُخ کیا گیا۔ حضرت معاویہؓ کی طرف سے امیر مکہ و مدینہ کو اس کام کے لیے مامور کیا گیا۔ مدینہ کا عامل مروان تھا۔ اس نے خطبہ دیا اور لوگوں سے کہا کہ امیر المومنین معاویہؓ ابوبکرؓ و عمرؓ

---

[1] جملہ عنوانات مفتی صاحب ہی کے تجویز فرمودہ ہیں۔

کی سُنت کے مطابق یہ چاہتے ہیں کہ اپنے بعد کے لیے یزید کی خلافت پر بیعت لی جائے۔ عبدالرحمٰنؓ ابن ابی بکر کھڑے ہوئے اور کہا کہ یہ غلط ہے، یہ ابوبکرؓ و عمرؓ کی سنت نہیں، بلکہ کسریٰ و قیصر کی سنت ہے۔ ابوبکرؓ و عمرؓ نے خلافت اپنی اولاد میں منتقل نہیں کی اور نہ اپنے کنبہ و رشتہ میں۔ حجاز کے عام مسلمانوں کی نظریں اہلِ بیتِ اطہار پر لگی ہوئی تھیں، خصوصاً حضرت حسینؓ بن علیؓ پر، جن کو وہ بجا طور پر حضرت معاویہؓ کے بعد مستحقِ خلافت سمجھتے تھے۔ وہ اس میں حضرت حسینؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ، عبداللہؓ بن زبیر اور عبداللہؓ بن عباس کی رائے کے منتظر تھے کہ وہ کیا کرتے ہیں۔ ان حضرات کے سامنے اوّل تو کتاب و سنت کا یہ اصول تھا کہ خلافتِ اسلامیہ خلافتِ نبوت ہے، اس میں وراثت کا کچھ کام نہیں کہ باپ کے بعد بیٹا خلیفہ ہو، بلکہ ضروری ہے کہ آزادانہ انتخاب سے خلیفہ کا تقرر کیا جائے۔ دوسرے یزید کے ذاتی حالات بھی اس کی اجازت نہ دیتے تھے کہ اس کو تمام ممالکِ اسلامیہ کا خلیفہ مان لیا جاتے۔ ان حضرات نے اس سازش کی مخالفت کی اور ان میں سے اکثر آخر دم تک مخالفت پر جمے رہے۔ اس حق گوئی اور حمایتِ حق کے نتیجہ میں مکہ و مدینہ میں دار و رسن اور کوفہ و کربلا میں قتلِ عام کے واقعات پیش آئے۔"

"حضرت معاویہؓ مکہ میں"

"حضرت معاویہؓ حج کے لیے مکہ مکرمہ تشریف لائے۔ یہاں اوّل حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو بلایا اور فرمایا: "اے ابن عمر! تم مجھ سے کہا کرتے تھے کہ مجھے ایک رات ایسی گزارنا پسند نہیں جس میں میرا کوئی امیر نہ ہو۔ میں نے اس امر کے پیشِ نظر اپنے بعد کے لیے یزید کی خلافت پر بیعت لے لی ہے کہ میرے بعد مسلمانوں میں افراتفری نہ پھیلے۔ سب مسلمان اس پر متفق ہو گئے۔ تعجب ہے کہ آپ اختلاف کرتے ہیں۔ میں آپ کو متنبہ کرتا ہوں کہ مسلمانوں کے جمع شدہ نظم کو مختل نہ کریں اور فساد نہ پھیلائیں۔"

حضرت ابن عمرؓ نے حمد و ثنا کے بعد فرمایا:

"آپ سے پہلے بھی خلفاء تھے اور ان کے بھی اولاد تھی۔ آپ کا بیٹا کچھ ان کے بیٹوں سے بہتر

نہیں ہے۔ مگر انہوں نے اپنے بیٹوں کے لیے وہ رائے قائم نہیں کی جو آپ اپنے بیٹے کے لیے کر رہے ہیں، بلکہ انہوں نے مسلمانوں کے اجتماعی مفاد کو سامنے رکھا۔ آپ مجھے تفرقِ ملت سے ڈراتے ہیں، سو آپ یاد رکھیں کہ میں تفرقہ بین المسلمین کا سبب ہرگز نہ بنوں گا۔ میں مسلمانوں کا ایک فرد ہوں۔ اگر سب مسلمان کسی راہ پر پڑ گئے تو میں بھی ان میں شامل رہوں گا۔"

"اس کے بعد عبدالرحمن بن ابی بکرؓ سے اس معاملے میں گفتگو فرمائی۔ انہوں نے شدت سے انکار کیا کہ میں اس کو کبھی قبول نہیں کروں گا۔ پھر عبداللہ بن زبیرؓ کو بلا کر خطاب کیا، انہوں نے بھی ایسا ہی جواب دیا۔"

اجتماعی طور پر معاویہؓ کو صحیح مشورہ"

"اس کے بعد حضرت حسینؓ بن علیؓ اور عبداللہ بن زبیرؓ وغیرہ جا کر معاویہؓ سے ملے اور ان سے کہا کہ آپ کے لیے یہ کسی طرح مناسب نہیں ہے کہ آپ اپنے بیٹے یزید کے لیے بیعت پر اصرار کریں۔ ہم آپ کے سامنے تین صورتیں رکھتے ہیں جو آپ کے پیشرووں کی سنت ہے:

۱۔ آپ وہ کام کریں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا کہ اپنے بعد کسی کو متعین نہیں فرمایا، بلکہ مسلمانوں کی رائے عام پر چھوڑ دیا۔

۲۔ یا وہ کام کریں جو ابوبکرؓ نے کیا کہ ایک ایسے شخص کا نام پیش کیا جو نہ ان کے خاندان کا ہے، نہ ان کا کوئی قریبی رشتہ دار ہے اور اس کی اہلیت پر بھی سب مسلمان متفق ہیں۔

۳۔ یا وہ صورت اختیار کریں جو حضرت عمرؓ نے کی کہ اپنے بعد کا معاملہ چھ آدمیوں پر دائر کر دیا۔ اس کے سوا ہم کوئی چوتھی صورت نہیں سمجھتے، نہ قبول کرنے کے لیے تیار ہیں۔ مگر معاویہؓ کو اس پر اصرار رہا کہ اب تو یزید کے ہاتھ پر بیعت مکمل ہو چکی ہے۔ اس کی مخالفت آپ لوگوں کو جائز نہیں ہے۔" "شہید کربلا" دارالاشاعت، مولوی مسافر خانہ، کراچی ص ۱۱ تا ۱۶

اب مولانا مودودی کی عبارتوں پر جس طرح کی حاشیہ آرائی اور ان سے جس طرح کا استنتاج مدیر البلاغ نے کیا ہے، اگر دوسرا شخص بھی وہی طریقہ اختیار کرے تو کہہ سکتا ہے کہ یزید کی بیعتِ ولایت عہد کے معاملہ کو سازش

اور امیر معاویہؓ کو خوشامد پسند قرار دینا نیت پر حملہ ہے جس کا حق کسی شخص کو نہیں دیا جاسکتا اور حضرت معاویہؓ کے متعلق یہ کہنا کہ وہ اپنے صاحبزادے اور اس کی ولی عہدی کے حق میں پروپیگنڈا کرتے تھے اور صحابہ کرام کو ڈراتے دھمکاتے تھے، ان پر بدعنوانیوں کا الزام ہے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ مولانا موصوف کی تحریر کو یہ معانی پہنانا اور ان سے یہ نتائج برآمد کرنا بالکل غلط ہے اور جو کچھ انہوں نے فی الاصل فرمایا ہے، وہ بالکل درست اور تاریخی تواتر سے ثابت ہے۔ البتہ میں مولانا محمد تقی صاحب سے ایک سوال ضرور کروں گا اور وہ یہ کہ جب مولانا مفتی محمد شفیع صاحب بھی حضرت حسینؓ، حضرت عبداللہ ابن عمرؓ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ اور حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہم کی یہ رائے بلا تنقید نقل کر رہے ہیں کہ "کتاب و سنت کا اصول یہ ہے کہ خلافتِ اسلامیہ، خلافتِ نبوت ہے اور اس میں وراثت کا کچھ کام نہیں کہ باپ کے بعد بیٹا خلیفہ ہو" اور نہ مفتی صاحب کے بقول یزید کو ولی عہد بنانا "ایک سازش، خلافت اسلامیہ پر ایک حادثۂ عظیمہ اور اسلام پر ایک حادثہ" تھی تو پھر اس کے جواز پر اجماعِ امت کیسے ہوگیا جسے ثابت کرنے کی سعی "البلاغ" میں کی گئی ہے؟ میں حیران ہوں کہ بیٹے اور یزید جیسے بیٹے کی ولی عہدی کے جواز پر اجماع کے بعد پھر آخر شیعہ حضرات کے نظریۂ وصیت پر کیا اعتراض باقی رہ جاتا ہے۔ وہ بھی تو یہی کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عم زاد اور داماد کو اپنا جانشین نامزد کر دیا اور پھر آگے اسی طرح باپ کے بعد بیٹے تک امامت منتقل ہوتی رہی۔

اسلامی ریاست اور عہدِ جدید

عبدالحمید صدیقی

اسلام کے مخالفین نے عوام میں، اور خصوصاً جدید تعلیم یافتہ طبقے میں اسلامی ریاست کے متعلق بڑی عجیب و غریب قسم کی غلط فہمیاں پھیلانے کی مذموم کوششیں کی ہیں۔ انہوں نے ان کے ذہن میں کچھ اس طرح کا تصور قائم کیا ہے کہ اسلامی ریاست کے معرضِ وجود میں آتے ہی قرونِ وسطیٰ اپنی ساری پس ماندگی اور تاریک خیالی کے ساتھ واپس پلٹ آئے گا۔ یہ ایک الگ بحث ہے کہ کیا جس دور کو یہ لوگ پس ماندہ کہتے ہیں وہ فی الحقیقت پس ماندہ تھا یا جس چیز کو آج پس ماندگی اور فرسودگی سے تعبیر کیا جاتا ہے وہ واقعی پسماندگی اور فرسودگی ہی ہے لیکن مخالفین اسلامی ریاست کا جو نقشہ پیش کرتے ہیں وہ بڑا ہی مضحکہ خیز ہے۔ ان کے خیال کے مطابق یہ مملکت سائنس اور صنعتی ترقیوں سے یکسر محروم ہوگی بلکہ اس کی حدود میں ترقی کے سارے نشانات کو حرفِ باطل کی طرح مٹا دیا جائے گا۔ ملک کو ریگستان بنا دیا جائے گا جس میں ہر طرف اونٹ چلا کریں گے۔ ہوائی جہاز، ریل، ریڈیو، ٹیلیفون، ٹیلیویژن اور بجلی کا خاتمہ ہو جائے گا اور ان کی جگہ ہر طرف گھوڑے، گدھے چلتے پھرتے اور تیل کے چراغ جلتے نظر آئیں گے۔ ہسپتالوں کی جگہ تعویذ گنڈوں کی دکانیں سجائی جائیں گی اور یونیورسٹیوں کالجوں اور سکولوں کو چٹائیاں بچھے ہوتے مدرسوں میں تبدیل کر دیا جائے گا۔ اسلامی ریاست کا یہ گھناؤنا تصور جس کا حقیقت سے کوئی دور کا بھی تعلق نہیں بڑی عیاری کے ساتھ اس لیے پیش کیا جاتا ہے کہ لوگ اس مملکت کو محض خام خیالی اور اس کے قیام کی کوشش کو اندھا جنون سمجھیں۔

اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے یہ لوگ بالعموم اس تمثیل کا سہارا لیتے ہیں کہ جس طرح وہ لباس جو ایک پانچ سالہ بچے کے لیے تیار کیا گیا ہو، پچیس سالہ نوجوان کے جسم پر راست نہیں آسکتا اسی طرح یہ بات بھی عقل و فکر کے منافی ہے کہ وہ قوانین اور ضابطے جو چھٹی یا ساتویں صدی کے پس ماندہ معاشرے میں

کسی حد تک مفید ثابت ہوئے تھے ان سے آج کے ترقی یافتہ دور میں کوئی رہنمائی حاصل کی جاسکے۔ چونکہ یہ دلیل اور یہ تمثیل بار بار پیش کی جاتی ہے اس لیے ہم سب سے پہلے اسی کا تجزیہ کرتے ہیں۔

اس سلسلے میں پہلی بات یہ ذہن نشین رہنی چاہیے کہ لباس کو قانون پر قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے۔ لباس کی لمبائی چوڑائی محدود ہوتی ہے لیکن قانون میں ہمیشہ ارتقاء ہوتا رہتا ہے۔ اسلامی معاشرے میں نت نئے مسائل کے بارے میں اجتہاد اور نئے حالات کی روشنی میں ان کی تحقیق اس حقیقت پر شہادت فراہم کرتی ہے کہ قانون کبھی جامد نہیں ہوتا بلکہ اپنی مخصوص روح اور مزاج کے ساتھ ایک خاص نہج پر ترقی کرتا رہتا ہے اِس لیے قانون کے بارے میں لباس کی تمثیل بالکل غلط ہے۔ اس کے لیے اگر کوئی صحیح تمثیل دی جاسکتی ہے تو وہ روح اور جسم کے اعضا کی ہے۔ جس طرح روح جس سے انسان کی زندگی وابستہ ہوتی ہے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تبدیل نہیں ہوتی بالکل اسی طرح کسی قوم کے اساسی تصورات جن سے اس کی اجتماعی زندگی عبارت ہوتی ہے کبھی نہیں بدلتے بلکہ جوں کے توں قائم رہتے ہیں۔ باقی رہے ہیئتِ اجتماعی کے لیے اصول و ضوابط تو ان کی حیثیت بھی لباس کی نہیں بلکہ اعضاء اور جوارح کی سی ہے جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھتے اور نشوونما پاتے ہیں۔ اگر روح انسان کے اندر جوں کی توں قائم رہ سکتی ہے، اگر اس کے وہ اعضاء جو اُسے پیدائش کے وقت عطا کیے گئے تھے تنومند ہو کر بدلتے ہوئے حالات کے تقاضے پورے کر سکتے ہیں، تو آخر کیا وجہ ہے کہ کسی قوم کے اساسی تصورات اور اس کے اجتماعی ڈھانچوں کو جو اس کے تصورات کا مظہر ہوتے ہیں، بوسیدہ کہہ کر اسے انہیں ترک کرنے کی تلقین کی جائے؟ کیا انسانوں کو اپنی روح اور اپنے اعضاء کو بدلنے کا کبھی کسی دانشمند شخص نے مشورہ دیا ہے؟

اسلامی ریاست کے بارے میں دوسری غلط فہمی یہ پھیلائی جاتی ہے کہ یہ ایک پس ماندہ دور کی یادگار ہے اور ترقی پذیر معاشرے کے تقاضے پورے کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ لیکن ہمیں اس سلسلے میں اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ ترقی اور پس ماندگی، انفرادی اور اجتماعی زندگی کی کن دو مختلف کیفیات کے نام ہیں؟ کیا کوٹ پتلون پہننا اور سر بفلک عمارات تعمیر کرنا ترقی ہے اور سادہ مگر صاف ستھری زندگی بسر کرنا پس ماندگی ہے؟ ترقی اور پس ماندگی پر اگرچہ کتابوں اور مقالات کی صورت میں بہت کچھ لکھا جاچکا ہے لیکن جس ایک

نتیجے پر قریب قریب سبھی مفکرین متفق ہیں وہ یہ ہے کہ انسان کے خیالات اور اس کی ہمدردی اور محبت کے دائرے میں جس قدر وسعت ہوگی اسی نسبت سے انسان زیادہ ترقی یافتہ کہلانے کا مستحق ہوگا اور جس نسبت سے اس کے خیالات محدود اور اس کی ہمدردی اور محبت کا دائرہ تنگ ہوگا اسی تناسب سے وہ پسماندہ ہوگا۔ ہم اس تعریف کو اگرچہ جامع اور مانع نہیں سمجھتے لیکن چونکہ مغربی مفکرین کے نزدیک یہ متفق علیہ ہے اس لیے ہم اس معیار کو سامنے رکھتے ہوئے ترقی کے دعویداروں کو یہ دعوت دیتے ہیں کہ وہ اس بات کا خود فیصلہ کریں کہ کیا دورِ جدید واقعی ترقی کا دور ہے؟ کیا آج کے انسان کے خیالات ماضی کے انسانوں کی بہ نسبت زیادہ وسیع اور اس کی محبت اور ہمدردی کا دائرہ زیادہ کشادہ ہے؟ اگر کسی شخص کی آنکھوں کو دورِ جدید کی ظاہری چمک دمک نے بالکل خیرہ نہیں کر دیا تو وہ کبھی اس دور کو ترقی یافتہ دور نہیں کہہ سکتا۔ آج دنیا کا کونسا ایسا ملک اور معاشرہ ہے جہاں انسانی مسائل پر قومی مفادات سے بلند تر ہو کر خالص انسانی بنیادوں پر غور و فکر کیا جاتا ہے؟ خیالات کی وسعت کا اظہار خیالی خاکوں کی ترتیب سے نہیں ہوتا بلکہ انسانیت کے وسیع تر مفادات کے نقطۂ نظر سے غور و فکر کی عادت اور اس کے لیے صحیح لائحہ عمل کی تشکیل سے ہوتا ہے۔ اسی طرح انسانی ہمدردی اور محبت کے دائرے کی وسعت کا اصل معیار "انسانیت دوستی" کے محض کھوکھلے نعرے نہیں بلکہ عمل ہے۔ دنیا کے غالباً سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملک میں ترقی یافتہ قوموں کے بہترین نمائندے انسانوں کے درمیان عدل و انصاف کے قیام کے دعوے کے ساتھ اقوامِ متحدہ میں جمع ہیں۔ مگر ان کے بلند بانگ دعووں کے باوجود وہاں قدم قدم پر تنگ نظری، تعصب اور مفاد پرستی کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ مظلوم اور کمزور طبقوں اور ممالک کو آج اسی طرح ظلم و ستم کا نشانہ بنایا جا رہا ہے جس طرح کہ پرانے زمانے میں ظالم حکمران بنایا کرتے تھے۔ کیا موجودہ دور کے جارحانہ قوم پرستی کے نظریات، طبقاتی کشمکش اور تشدد کے ذریعے انقلابات کے تصورات انسانیت دوستی کے مظہر ہیں؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ ماضی میں بھی مفاد پرستوں نے اپنے ناجائز مفادات کے حصول کی خاطر اور بہت سے بادشاہوں نے اپنی کبریائی کے ٹھاٹھ جمانے کی غرض سے انسانوں پر مظالم ڈھائے۔ مگر عام انسانوں نے ان کے ظلم و استبداد کو ہمیشہ نفرت کی نگاہ سے دیکھا۔ تاریخ میں انہیں کبھی اچھے نام سے یاد نہیں کیا گیا۔ یہ

فخر صرف موجودہ دَور کو حاصل ہے کہ اس نے جارحانہ قوم پرستی کو قوم پروری، طبقاتی تصادم کو عدل و انصاف، سیاسی، معاشرتی اور معاشی جکڑبندیوں کو فلاحی اقدام اور جبر و استبداد کو منصوبہ بندی سے تعبیر کرکے انسانیت کو سخت دھوکہ دیا ہے۔

اِن ابتدائی گزارشات کے بعد اب اسلامی ریاست کے چند بنیادی اصولوں کی نشاندہی کرکے ہم یہ بتاتے ہیں کہ اس ریاست کے قیام سے دنیا میں کس نوعیت کا فکری روحانی اور اخلاقی انقلاب رونما ہوگا۔

جو لوگ بھی اسلام سے کچھ واقفیت رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ اسلامی ریاست کا سب سے پہلا اور بنیادی اصُول یہ ہے کہ اس میں حاکمیت نہ تو کسی فرد کی ہے، نہ کسی خاندان کی، نہ کسی طبقے کی، نہ قوم کی، نہ عوام کی، نہ پُوری انسانیت کی، بلکہ صرف خدا کی ہے۔ حاکمیت خداوندی کو بعض لوگوں نے محض ایک دلکش تصور سمجھ رکھا ہے اور اس کی عملی افادیت پر بہت کم غور کیا ہے۔ انسانیت کی پُوری تاریخ میں اس سے زیادہ حیات آفریں اور انقلاب انگیز تصور انسان کے سامنے کبھی پیش ہی نہیں ہُوا۔ اس کا سادہ سا مطلب یہ ہے کہ فرماں روائی کا حق صرف خالقِ کائنات کو حاصل ہے۔ یہ تصور دوسری مذہب پسند قوموں میں بھی کسی نہ کسی شکل میں پایا جاتا ہے۔ لیکن انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ خدا کی فرمانروائی کا دائرہ صرف عالم طبیعیات تک محدود ہے اور انسان اپنی زندگی کے اختیاری دائرے میں خدا کی فرمانروائی سے یکسر آزاد ہے۔ اسی وجہ سے انہوں نے انسان کی معاشرتی سیاسی، معاشی اور اخلاقی زندگی کے لیے نہ تو احکامِ خداوندی معلوم کرنے کی کوشش کی ہے اور نہ ان کی پابندی کا خیال ان کے دل میں کبھی پیدا ہُوا ہے۔ اس اختیاری دائرے میں وہ انسان کے بنائے ہوئے قوانین اور ضابطوں کی پابندی کرتے ہیں یا علمی اصطلاح میں وہ انسان کی حاکمیت کے قائل ہیں۔

خالقِ کائنات کے بارے میں یہ تصور کتنا غلط ہے کہ یہ تو مان لیا جائے کہ اس نے عالمِ طبیعیات کے لیے قوانین اور ضابطے وضع کیے ہیں اور ان کی پابندی کی وجہ ہی سے کائنات کی ہر چیز خوش اسلوبی سے اپنا کام سرانجام دے رہی ہے۔ مگر انسان کو اس نے اس کے حال پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ اپنے لیے جس طرح کے ضابطے اور اصول چاہے وضع کرتا رہے۔ اسلام اس تصور کو بالکل باطل سمجھتا ہے اور وہ اس بات کا دعویدار ہے کہ خالق نے جس طرح عالمِ طبیعیات کے اصول دیئے ہیں اور اس عالم کو ان کا پابند بنایا ہے بالکل اسی طرح اس نے

انسانی رشد و ہدایت کے لیے بھی واضح احکام صادر فرمائے ہیں اور پھر اپنے انبیاء علیہم السلام کی وساطت سے ان کے عملی مضمرات سے بھی انسانوں کو پوری طرح آگاہ کر دیا ہے تاکہ ان کی پابندی کرنے میں انہیں کسی مقام پر کوئی مشکل پیش نہ آئے۔

دورِ جدید میں انسانوں کی اکثریت شاید کائنات کی اس بنیادی حقیقت کو بھول چکی ہے یا جان بوجھ کر اس نے اسے اپنی نگاہ سے اوجھل کر دیا ہے، اسی وجہ سے اس نے خدا کی حاکمیت ماننے کے بجائے انسان کی حاکمیت کا قلادہ اپنی گردنوں میں ڈال رکھا ہے۔ انسان کی حاکمیت سے مراد یہ ہے کہ اس کی عملی جدوجہد کی قدر و قیمت، اس کے مقصد و منہاج یا دوسرے لفظوں میں اس کے خوب و ناخوب کے پیمانے خود انسان متعین کرے۔ یہ فساد کا وہ اصل سرچشمہ ہے جس نے انسانی زندگی کو سزا یا عذاب بنا رکھا ہے۔ اس عذاب کی لاتعداد صورتیں اور لامحدود دائرے ہیں مگر ان میں چند صورتیں اور دائرے بڑے نمایاں ہیں جن کا ہم ذیل میں ذکر کرتے ہیں۔

لادینیت کے علمبردار بڑے طنطنے کے ساتھ یہ کہتے ہیں کہ مذہب نے انسان کو ذلت و خواری کے نہایت پست مقام تک دھکیل رکھا تھا، یہ دورِ جدید کا فیضان ہے کہ انسان بندگی کے نچلے مقام سے بلند ہو کر اب حاکمیت کے اعلیٰ مقام پر فائز ہوا ہے اور اب وہ مذہبی توہمات کے چنگل سے اور مذہبی طبقوں کے تسلط سے آزاد ہو کر اپنی دنیا خود اپنے مفاد کے مطابق تعمیر کرتا ہے۔ یہ دعویٰ تو بڑا دلکش ہے مگر خدا کی حاکمیت کو ترک کر کے اس نے عملی طور پر اپنے آپ کو نمرود کی خدائی کا غلام بنا لیا ہے۔ جہاں تک نعرے کا تعلق ہے وہ تو انسان کی حاکمیت ہی ہے لیکن ظاہر بات ہے کہ پوری انسانیت ایک ہی شیرازہ بندی کے ساتھ اپنے لیے ضابطۂ حیات مرتب نہیں کر سکتی، اس لیے سب سے پہلے تو وہ رنگ، نسل، زبان اور وطن کی بنیادوں پر چھوٹے چھوٹے حصوں میں منقسم ہوتی ہے پھر ہر حصے کے عوام اس زعم میں مبتلا کر دیئے جاتے ہیں کہ حاکمیت کے حقوق انہیں حاصل ہیں۔ مگر اس پہلی منزل پر ہی انسانیت کو دو ناقابلِ تلافی نقصانات پہنچتے ہیں۔

ایک یہ کہ بالکل مصنوعی اور اتفاقی امتیازات کی بنا پر انسانیت مختلف متحارب گروہوں میں بٹ جاتی ہے جن میں سے ہر گروہ دوسرے کو مٹانے اور دبانے کے لیے ہر لحظہ بیتاب رہتا ہے۔ کیونکہ اگر ان کے مابین مستقل عداوت اور دشمنی موجود نہ رہے تو ان کا الگ قومی وجود قائم نہیں رہ سکتا۔ اس لیے ہر

گروہ کے چالاک اور عیار لوگ برابر اس امر کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ دوسرے گروہوں کے خلاف نفرت و حقارت کے جذبات اُبھارتے رہیں۔ انسانی اخوت کی بنیاد اس پہلے قدم پر ہی منہدم ہو جاتی ہے۔ انسان کی حاکمیت قبول کر لینے سے ہر قوم یا گروہ اس بات پر مجبور ہوتا ہے کہ وہ اپنی بقا کے لیے دوسرے کے خلاف اپنے قلب و دماغ میں نفرت کے بیج بوتا رہے اور پھر تصادم کے مواقع پیدا کر کے اس کی آبیاری کرتا رہے۔ دوسرا نقصان یہ پہنچتا ہے کہ قومی مفاد کے نام پر ہر قوم میں ایسے لوگ تختِ اقتدار پر متمکن ہوتے رہتے ہیں جو اپنی قوم کے قلب و دماغ میں منفی جذبات پالنے میں مہارتِ تامہ رکھتے ہوں۔ اس طرح دنیا میں آج ہر قوم کی سربراہی و قیادت عملاً ان لوگوں کے ہاتھ میں آگئی ہے جو اچھے خیالات اور پاکیزہ جذبات سے یکسر عاری ہیں اور انسانیت دشمنی جن کے ذہنوں میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے۔

بعض اوقات یہ بات عجیب معمہ معلوم ہوتی ہے کہ لوگ جن اشخاص کو عزت و توقیر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں یا جن کے خیالات کو انسانیت کے لیے مفید سمجھتے ہیں انہیں اقتدار کی مسند پر فائز کرنا گوارا نہیں کرتے۔ اس کی ایک واضح مثال انگلستان کے فلسفی برٹرینڈ رسل کی ہے۔ انگریز قوم کے دل میں اس شخص کا بڑا احترام تھا۔ سرکار کی طرف سے بھی اسے مختلف خطابات عطا کیے گئے تھے۔ اس کی کتابیں لاکھوں کی تعداد میں فروخت ہوتیں اور اُس کے خیالات کی بیشتر حلقوں میں پذیرائی ہوتی۔ مگر اسے کبھی اس بات کا موقع نہ دیا گیا کہ اجتماعی زندگی کا جو نقشہ اس کے پیشِ نظر ہے اور انگلستان کے اندر یا باہر جس کی تعریف و توصیف بھی کی جاتی ہے اس کو اس نقشے کے مطابق کام کرنے کے عملی مواقع فراہم کیے جائیں۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ انگریز جس جارحانہ قوم پرستی اور اس کے نتیجے میں جنم لینے والی جس تنگ نظری کا شکار رہے اس کی بنا پر اسے یہ بات کسی صورت بھی قبول نہ تھی کہ قومی مفاد کے دائرے سے نکل کر انسانی بنیادوں پر سوچنے والا کوئی شخص عملاً اس کی سربراہی کے لیے آگے بڑھے۔ اس شخص کو رسمی عزت و احترام کے باوجود نہ صرف حکومت کے ایوانوں سے دور رکھا گیا بلکہ کئی مرتبہ اسے جیل کی صعوبتیں بھی برداشت کرنی پڑیں۔ آج دنیا میں جو ہمہ گیر فساد اور بگاڑ رونما ہے اس کی بڑی وجہ یہی ہے کہ خدا کی حاکمیت سے بے نیاز ہونے کی وجہ سے قومی مفادات کی پرستش شروع ہو گئی ہے اور ان مفادات کی حفاظت و پاسبانی کے لیے

مختلف قوموں نے ایسے لوگوں کو قیادت و سیادت کا منصب سونپا ہے جو بڑے خود غرض، تنگ نظر، مفاد پرست اور ظالم ہیں۔ ممکن ہے سربراہی کے لالچ میں وہ اپنے ان منفی رجحانات و احساسات کو اپنی قوم سے کسی حد تک چھپانے میں کامیاب ہوں مگر دوسری قوموں کے ساتھ وہ کبھی بھی انسان دوستی اور عدل و انصاف کا رویہ اختیار نہیں کرتے بلکہ انہیں برباد کرنے میں پوری قوت کا مظاہرہ کرتے ہیں اور اپنی ہر طرح کی ظالمانہ کارروائیوں پر اترتے ہیں

صحیح بات تو یہ ہے کہ جس دن سے انسان حاکمیتِ خدا کے تصور سے بیگانہ ہوا ہے اسی دن سے انسانیت کی رہنمائی سے ایسے لوگ بے دخل ہو گئے ہیں جنہیں مذہب کی اصطلاح میں شہداء علی الناس اور حق و انصاف کے علمبردار کہا جاتا ہے۔ ان نیک نفس اور پاک طینت لوگوں کی عدم موجودگی کی وجہ سے زندگی کی گاڑی چلانے والوں میں آج انسانیت کا کوئی سچا خیر خواہ نظر نہیں آتا۔ قوموں کے معاملات چونکہ فساق و فجار کے ہاتھ میں ہیں اس لیے قومی اور بین الاقوامی سطح پر کسی معاملے کو حق و انصاف کے مطابق طے نہیں کیا جاتا۔ اجتماعی زندگی چالاکی، عیاری اور زبردست آزاری کا ایک مکروہ کاروبار بن گئی ہے۔ انسانیت پر سے یہ عذاب اسی صورت میں ٹل سکتا ہے کہ انسان، انسان کی غلامی سے آزاد ہو کر خدا کی غلامی قبول کرے اور اجتماعی زندگی کو مفاد پرستی کی بنیادوں پر استوار کرنے کے بجائے انسانی اخوت اور حق و انصاف کی بنیادوں پر استوار کرے۔ اسلامی ریاست کا قیام اس سلسلے کی پہلی کڑی ہے کیونکہ اس کے معرضِ وجود میں آنے ہی سے حیاتِ اجتماعی میں مفاد پرستی کی جگہ انسانیت نوازی، مکر و فریب کی جگہ خلوص اور دیانتداری، تنگ نظری اور تعصب کی جگہ وسعتِ قلب و نظر پیدا ہو گی اور انسان کسی گروہ یا قوم کا بندہ یا کسی مفاد کا بندہ بننے کے بجائے رب العالمین کا بندہ بن کر پوری انسانیت کے لیے اپنے دل میں جذبۂ محبت اور خیر خواہی پال کر حق کے ساتھ سرگرم عمل ہو گا۔ دورِ جدید میں اگر کوئی اجتماعی قوت انسانیت میں عدل و انصاف کی حکمرانی قائم کر سکتی ہے تو وہ صرف وہی ریاست اور قوم ہو سکتی ہے جو جارحانہ قومیت کے منفی جذبات سے یکسر عاری ہو اور انسانوں کے ساتھ انسانیت کی وسیع تر بنیادوں پر معاملہ کرے۔

اسلامی ریاست کا ایک اور قابلِ غور پہلو یہ ہے کہ اس کے ذریعے دنیا میں اُن اخلاقی اقدار کو فروغ ہوتا ہے جو حیاتِ اجتماعی میں توازن اور ٹھیراؤ پیدا کرتی ہیں۔ جب کسی مملکت میں حاکمیت انسان کی تسلیم کی جاتی ہے تو قدرتی طور پر اس میں انسان کے بنائے ہوئے ضابطے اور قوانین نافذ ہونگے۔ ظاہر بات ہے کہ کسی ملک کے سارے عوام ایک ہی جیسی قوت اور ایک جیسے اختیارات کے ساتھ تو قانون سازی میں شریک نہیں ہو سکتے۔ یہ کام انہیں مجبوراً اپنے میں سے ایک گروہ کو ہی سونپنا پڑتا ہے۔ یہ گروہ اس کے لیے اپنے خیال کے مطابق ضابطۂ حیات مرتب کرتا ہے۔ اس سلسلے میں دو بڑی دشواریاں پیش آتی ہیں۔ ایک تو انسانوں کے لیے یہ ناممکن ہے کہ وہ اپنے ذاتی رجحانات اور میلانات کو یکسر نظر انداز کر کے محض انسانیت کی فلاح و بہبود کو سامنے رکھتے ہوئے کوئی ضابطہ تشکیل دے سکیں۔ انسان میں فطری طور پر اتنی مکمل بے لوثی نہیں آسکتی کہ وہ اپنی ذات سے بالکل الگ ہو کر سوچے۔ دوسرے اسے اپنی سربراہی قائم رکھنے کے لیے معاشرے کے ان بارسوخ افراد اور مضبوط گروہوں کی تائید کی ضرورت ہوتی ہے جن کے بل پر وہ اس مقام پر زیادہ دیر تک فائز رہ سکے۔ اس لیے وہ لازمی طور پر آئین و قانون کی تشکیل میں اپنے ان مؤید گروہوں اور طبقات کا خیال رکھتا ہے اور نظامِ حیات اس انداز سے مرتب کرنے کی کوشش کرتا ہے جس سے اس کے حامی طبقوں کو زیادہ سے زیادہ دنیوی مراعات حاصل ہوں۔ اس لیے انسان جو نظام ترتیب دیگا اس میں لازمی طور پر بعض طبقوں کے حقوق پامال ہوں گے اور بعض کو اپنے جائز حصے سے زائد فوائد حاصل ہونے کا التزام ہوگا۔ انسان کے لیے یہ ناممکن ہے کہ وہ کسی ضابطۂ حیات میں تمام انسانوں کے ساتھ پوری طرح عدل و انصاف کا معاملہ کر سکے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایک معاشرے کے اندر ہی ایک دوسرے کے مخالف طبقات پیدا ہو جاتے ہیں اور اس طرح ملک کے اندر لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم ہو جاتا ہے اور متوازن اور جامع نظامِ حیات نہ ہونے کی وجہ سے ملک مستقل طور پر بدامنی کا شکار رہتا ہے۔

آج کے ترقی یافتہ دور میں آپ کسی ملک کا جائزہ لیں تو آپ وہاں بے چینی، اضطراب اور عدمِ تحفظ کی عام فضا پائیں گے۔ ہر گروہ دوسرے گروہ کا شاکی اور ہر طبقہ دوسرے سے برسرِ پیکار ہے

ممکن ہے بعض ممالک میں دہشت اور خوف کی وجہ سے محرومی کے جذبات پوری شدت کے ساتھ زبان پر نہ آئیں یا اضطراب ہنگاموں کی کوئی خوفناک شکل اختیار نہ کر سکے۔ مگر ہر گروہ دوسرے گروہ کا دشمن اور مخالف ضرور رہے گا۔ اس کی وجہ بجز اس کے اور کیا ہو سکتی ہے کہ اجتماعی زندگی کی تشکیل کے لیے برسرِ اقتدار طبقے آئین و ضوابط کا جو نظام بناتے ہیں ان میں بڑی جانبداری سے کام لیا جاتا ہے اور چند گروہوں اور طبقوں کی خوشنودی کی خاطر دوسروں کے حقوق بڑی بے دردی سے پامال کیے جاتے ہیں۔ غالباً اس صورتِ حال کو سامنے رکھ کر قانون کے بارے میں ایک مغربی مفکر نے یہ کہا تھا کہ قانون مکڑی کا جالا ہے جس میں اگر کوئی کمزور پھنس جائے تو وہ جکڑا جاتا ہے لیکن اگر کوئی مضبوط اور طاقتور اس کی گرفت میں آئے تو وہ اسے تار تار کر دیتا ہے۔

انسان کے بنائے ہوئے قوانین اور ضابطوں کے بارے میں اہلِ مغرب کا یہ تصور بالکل درست ہے کہ یہ طاقتور طبقوں کے تحفظ اور کمزوروں کی بے بسی کو جوں کا توں قائم رکھنے کے لیے وضع کیے جاتے ہیں۔ البتہ ان کی تدوین میں اس امر کا ضرور خیال رکھا جاتا ہے کہ بس محروم اور کمزور طبقوں میں ناانصافیوں کے خلاف کوئی شدید ردِ عمل پیدا نہ ہونے پائے اور وہ بغاوت کر کے کہیں اس پورے نظام کو درہم برہم نہ کر دیں۔

انسانی قانون کے اس غیر عادلانہ مزاج کو سمجھنے کے لیے کسی لمبی چوڑی تحقیق کی ضرورت نہیں بلکہ یہ دیکھنا کافی ہے کہ اس میں کمزوروں کو اگر ان کا کوئی جائز حق ملتا بھی ہے تو وہ تگ و دو اور کشمکش کے بعد ملتا ہے۔ ستم زدہ طبقے ایک لمبے عرصے تک اپنی محرومیاں اور طاقتور طبقوں کی زیادتیوں کے خلاف دلوں میں نفرت پالتے ہیں۔ پھر ان دراز دستیوں کے خلاف ان کا اجتماعی شعور بیدار ہوتا ہے پھر وہ اپنے غصب شدہ حقوق کے حصول کا مطالبہ کرتے ہیں۔ مگر طاقتور طبقوں میں کوئی جنبش پیدا نہیں ہوتی اور قانون کی مختلف دفعات اور شقیں انہیں پابند سلاسل کرتی اور انہیں ظلم و زیادتی کے خلاف آہ و فغاں تک کرنے سے باز رکھتی ہیں۔ اس کے بعد جب یہ ستم زدہ لوگ طاقتور طبقوں کے احساسات بیدار کرنے اور انہیں جھنجھوڑنے کے لیے جد و جہد کرتے ہیں تو حکومت کی قوتِ قاہرہ ان کے خلاف سرگرمِ عمل ہوتی

ہے اور قید و بند کی اذیتوں اور گولیوں سے ان کا راستہ روکتی ہے لیکن اس جبر و تشدد کے باوجود جب ان کی یلغار نہیں رکتی اور یہ خطرہ لاحق ہو جاتا ہے کہ کہیں یہ یلغار بغاوت کی صورت اختیار نہ کر لے تو پھر ان کے چند مطالبات مان کر انہیں خاموش کر دیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کا بنایا ہوا سارا قانون اور ضابطہ لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم رکھنے کے لیے تشکیل دیا جاتا ہے۔

اسلامی ریاست میں اس قسم کی نہ تو کوئی ناانصافی ہوتی ہے اور نہ مملکت کا دستور کسی قسم کے جبر و استبداد اور ناانصافی کو گوارا کرتا ہے۔ رب العٰلمین، جس نے انسان کو یہ قانون عطا کیا ہے وہ انسانوں کا ہی نہیں بلکہ پوری کائنات کا خالق اور حاکم ہے۔ اس کو سب کا مفاد ایک جیسا عزیز ہے۔ اس لیے اس نے اپنی حکمتِ بالغہ کے تحت عدل و انصاف کے ساتھ اس دستورِ حیات میں سب کے حقوق اچھی طرح متعین کر دیئے ہیں تاکہ کسی کے ساتھ بھی ظلم و زیادتی نہ ہو سکے۔ چنانچہ اسلامی ریاست میں کسی طبقے کو اپنے جائز حقوق حاصل کرنے کے لیے تگ و دو نہیں کرنی پڑتی بلکہ مملکت خود اس بات کی فکر مند رہتی ہے کہ ہر فرد کو اُس کے جائز حقوق خود بخود بغیر اس کی کسی کاوش کے دھوپ اور ہوا کی طرح میسّر ہوں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خلافت کا بوجھ سنبھالنے کے بعد اپنے پہلے خطبے میں اِسی بات کی نشاندہی کی تھی:

الضعیف منکم قوی عندی حتی ازیح علته ان شاء الله[1]	تم میں سے جو کمزور ہے وہ میرے نزدیک قوی ہے جب تک کہ خدا کی مدد سے اس کی شکایت دُور نہ کردوں۔

اسی طرح حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا:

ولا یدع فقیراً فی ولایته إلّا اعطاه ولا مدیونا الّا قضی عنه دینه ولا ضعیفاً الّا اعانه ولا مظلوما الا نصره ولا ظالماً الا منعه عن الظلم ولا عاریا الا کساه کسوة[2]	اُن کی مملکت میں کوئی ایسا محتاج نہ چھوڑا جائے گا جس کی حاجت روائی نہ کی جائے، کوئی مقروض ایسا نہ ہوگا جس کا قرض ادا نہ کر دیا جائے، کوئی کمزور ایسا نہ ہوگا جس کی مدد نہ کی جائے۔ کوئی مظلوم ایسا نہ ہوگا جس کی حمایت نہ کی جائے، کوئی ظالم ایسا نہ ہوگا جسے اس کے

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۵ ص ۲۴۸   [2] شرح شرعۃ الاسلام۔ سید علی زادہ

ظلم سے باز نہ رکھا جائے اور کوئی ننگا نہ ہوگا جسے تن ڈھانپنے
کے لیے کپڑا نہ دیا جائے۔

ان تصریحات سے یہ حقیقت پوری طرح منکشف ہوجاتی ہے کہ اسلامی ریاست طاقتور طبقوں کے مفادات کے تحفظ اور بے بس طبقوں کو کچلنے کے لیے معرضِ وجود میں نہیں آتی بلکہ کمزوروں اور بے بسوں کے حقوق کی حفاظت اور پاسبانی کے لیے قائم ہوتی ہے۔ ان کا تحفظ اس مملکت کے بنیادی فرائض میں شامل ہوتا ہے۔

اگر عوام کے اندر یہ احساس پوری طرح پیدا ہوجائے کہ اُن کے ملک کا دستور و قانون کسی طبقے یا گروہ کی مرضی کا نمائندہ نہیں ہے اور نہ وہ مخصوص مفادات کے تحفظ کے لیے بنایا گیا ہے بلکہ وہ اس ہستی کے احکام پر مبنی ہے جسے تمام انسانوں کی فلاح یکساں عزیز ہے اور اس نے یہ احکام عدل و انصاف کی حکمرانی قائم کرنے اور ہر فرد کے حقوق کی حفاظت اور نگہبانی کرنے کے لیے دیئے ہیں تو ان کے دل میں ایسے قانون اور دستور کے لیے جذبۂ احترام پیدا ہوگا اور اسے توڑنے کا خیال کرتے ہوئے بھی وہ اپنے ضمیر میں خود اپنے آپ کو مجرم سمجھیں گے۔ دنیا کے تمام ممالک میں آج جو ہمہ گیر اضطراب نظر آتا ہے اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ملکوں کے عوام کا اعتماد آئین و قانون اور خود مملکت پر سے اٹھ گیا ہے۔ وہ اپنے دلوں میں یہ تاثر رکھتے ہیں کہ آئین طاقتور طبقوں کے ہاتھ میں محض ظلم کا ہتھیار ہے جسے وہ مملکت کی قوت کے ذریعے بے کسوں کے خلاف استعمال کرتے ہیں۔ اس بنا پر ان کے دلوں میں آئین اور مملکت کے لیے احترام کے بجائے اس کے خلاف حقارت و نفرت کا ایک نہ مٹنے والا جذبہ موجزن رہتا ہے اور ان دونوں کو نقصان پہنچانے میں انہیں راحت محسوس ہوتی ہے۔ اسلامی ریاست کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ اس کے دستور کی بنیاد چونکہ احکامِ الٰہی پر ہوتی ہے اور یہ معاشرے میں ظلم و استبداد کا ہتھیار بننے کے بجائے عدل و انصاف کا علمبردار ہوتا ہے اس لیے عوام کے دلوں میں اس کے لیے بے پناہ جذبۂ محبت و عقیدت موجود رہتا ہے اور وہ اس کی پابندی کو اپنے لیے دنیوی فلاح اور اُخروی سعادت کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔

ایک اور پہلو سے دیکھیے تو دنیا میں انسان کے ساختہ تمام دساتیر اور ضابطے قومی اور مادی مفادات کے نقطۂ نظر سے مرتب ہوتے ہیں اس لیے ملک کے اندر اور باہر معمولی نوعیت کے معاشی تغیرات سے دستوری

ڈھانچوں میں زبردست تبدیلیوں کی ضرورت پیش آتی رہتی ہے۔ جب ہر فرد یا گروہ زندگی کا رہنما اصول یہ قرار دے کہ اُسے دوسروں کے حقوق غصب کرکے اپنے لیے زیادہ سے زیادہ معاشی مفادات کے حصول کا التزام کرنا ہے تو ملک کی معاشی ہیئت میں معمولی تبدیلیوں سے بھی آئین اور دستور میں اہم تبدیلیاں کرنی پڑیں گی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس معاشرے کی اخلاقی اقدار اور خوب و ناخوب کے پیمانے بھی ہر وقت بدلتے رہیں گے اور ملک کے اندر کوئی مستقل اخلاقی معیار یا شرافت کی پائیدار روایات قائم نہ ہو سکیں گی۔ لادینی ریاستیں درحقیقت اُس اخلاقی لنگر سے بالکل محروم ہوتی ہیں جو معاشرے میں توازن اور اقدارِ حیات میں استقلال پیدا کر سکے۔ اسی بنا پر تغیر کی معمولی لہر ان کے پورے نظام کو تہ و بالا کرکے رکھ دیتی ہے۔ بعض انجان لوگ اسے عوام کی فتح قرار دیتے ہیں۔ مگر حقیقت میں یہ انسان کی بڑی بدبختی ہے۔ سائنسی ایجادات اور انکشافات کی وجہ سے اگر تجربہ گاہوں کے ساز و سامان بدلتے رہیں تو اس سے کوئی نقصان نہیں پہنچتا لیکن ہر آن بدلتی ہوئی اقدارِ حیات سے انسانیت کو شدید نقصان پہنچتا ہے۔

آپ کسی مادی شے کی نوعیت اور اس کی قدر و قیمت کا سائنسی تجزیوں کی مدد سے بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں مگر اخلاقی اقدار کے معاملے میں اس طرز کے تجزیے نہیں کیے جا سکتے۔ کسی فعل یا عادت یا معاشرتی رجحان کی قدر و قیمت متعین کرنے کے لیے ایک لمبی مدت تک غور و فکر کرنا پڑتا ہے تب کہیں جا کر اس کے مختلف گوشے اپنی خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔ اس کی وضاحت کے لیے دو مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ یورپ میں جب صنعتی انقلاب آیا اس وقت مزدور طبقہ بالکل بے بس ہو کر رہ گیا۔ سرمایہ داروں نے ان کی اس بے بسی سے فائدہ اٹھا کر ان کی محنت کا جی بھر کر استحصال کیا اور مردوں کے ساتھ عورتوں کو بھی کام کرنے پر مجبور کر دیا۔ اب اس بات کا تجزیہ تو بالکل آسان ہے کہ عورتوں میں چونکہ اجتماعیت کا شعور بہت کم ہوتا ہے اس لیے ان کی محنت بڑے سستے داموں خریدی جا سکتی ہے، لیکن عورتوں کے معاشی میدان میں براہِ راست عمل دخل سے جو لاتعداد اخلاقی مسائل اور پیچیدگیاں پیدا ہوئی ہیں اور ان سے انسانیت کو جو عظیم نقصان پہنچا ہے اس کا تجزیہ نہیں کیا جا سکتا۔

اسی طرح یہ دیکھیے کہ کسی ملک کو جلد از جلد صنعتی ترقی دینے کے لیے یہ ایک کامیاب حربہ ہے کہ ملک پر

آمریت مسلط کر دی جائے اور پیدائش دولت اور تقسیم دولت کے سارے ذرائع حکومت کی تحویل میں دے دیئے جائیں۔ اس ترقی کا سبب ظاہر ہے کہ انسان کو جب حیوان کی سطح پر رکھ کر اس سے بے تحاشا کام لیا جاتا ہے تو اس سے قدر زائد کی بہت بڑی مقدار حکومت کی تحویل میں چلی جاتی ہے جسے صنعتی ترقی کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ یہ تجزیہ بالکل آسان اور سادہ ہے۔ مگر انسان کو اس طرح حیوان بنانے کے اخلاقی اور روحانی نقصانات کے صحیح اندازے کے لیے ایک طویل مدت درکار ہے۔ انسان کو اس اشتراکی تجربے سے جو اخلاقی نقصانات پہنچیں گے ان کی صحیح نوعیت عرصۂ دراز کے بعد ہی سامنے آئے گی اور طویل اور صبر آزما مراحل سے گزر کر ہی انسان اس بات کا فیصلہ کر سکے گا کہ اس نے اس تجربے میں کیا پایا اور کیا کھویا ہے۔ انسان کے پاس وحیٔ الہام ہی ایک قابلِ اعتماد ذریعہ ہے جس کی مدد سے وہ کسی فعل کے اخلاقی اور روحانی پہلوؤں کا اچھی طرح اندازہ کر سکتا ہے اور اسے بربادی سے بچنے کے لیے بار بار بربادی کے مراحل سے گزرنا نہیں پڑتا۔ ڈاکٹر اقبال مرحوم نے وحی کی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ انسانی تجربات کی کفایت ہے ITISAN ECONOMY OF HUMAN EXPERIENCE یعنی جس نتیجے پر انسان لاکھوں ٹھوکریں کھا کر بعد از خرابیٔ بسیار پہنچتا ہے قادرِ مطلق انسان کو اس کے متعلق پہلے قدم پر ہی آگاہ کر دیتا ہے۔ چنانچہ اسلامی ریاست جس کا دستور قرآن و سنت کی بنیاد پر تشکیل پاتا ہے اس میں انسان بربادیوں کے ان روح فرسا تجربات سے نہیں گزرتا بلکہ اپنی قوتوں کو وحی و الہام کی روشنی میں تعمیری کاموں پر لگاتا ہے اور دنیوی اور اُخروی فلاح حاصل کرتا ہے۔

تصحیح

تفہیم القرآن جلد اوّل اور جلد دوم میں حسبِ ذیل مقامات کی تصحیح کر لی جائے:

جلد اوّل: صفحہ ۴۰۶ سطر ۸ ۔ "اور اس کے رسولوں پر" کے بجائے "اور اس کے رسول پر"

جلد دوم: صفحہ ۲۱۲ سطر ۱۲ "اور اس کے رسول کی" کے بجائے "اور اللہ اور اس کے رسول کی"

— عالمِ اسلام، حالات و واقعات کے آئینے میں —

عربوں میں فکری انتشار پھیلانے کی تحریک

(جناب خلیل حامدی صاحب)

لبنان سیاسی اور علمی لحاظ سے پوری ایک صدی سے عالمِ عرب پر اپنے غیر معمولی اثرات ڈال رہا ہے۔ دنیائے عرب کی تمام فکری اور اجتماعی تحریکوں کا آغاز لبنان کے دار الحکومت بیروت سے ہوا ہے ۱۸۶۶ء میں بیروت میں سیرین انجیل کالج (الکلیۃ السوریۃ الانجیلیۃ) قائم کیا گیا تھا جو اب امریکن یونیورسٹی کے نام سے مشہور ہے۔ عربوں کے تعلیم یافتہ طبقے میں مغربی تہذیب اور مغربی ذہن و فکر کو فروغ دینے میں اس ادارے نے بے پناہ کردار ادا کیا ہے۔ ترکوں کے خلاف عربوں کی قومی تحریک کے بیج بھی اسی ادارے نے بوئے۔ پہلی جنگِ عظیم کے بعد اشتراکی ممالک نے بھی شرقِ اوسط میں اپنا اثر و نفوذ بڑھانے کے لیے لبنان ہی کو اپنا مرکز بنا لیا۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ لبنان مغربی استعمار اور اشتراکی بلاک دونوں کی کشمکش کی آماجگاہ بن چکا ہے اور دونوں کیمپوں کے حامی عناصر اپنے اپنے اثرات کو بڑھانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں۔ جہاں تک اسلام اور اسلامی تاریخ اور خالص عربی تہذیب و ثقافت کا تعلق ہے یہ دونوں کیمپ اس کے خلاف متحد ہو جاتے ہیں۔ اس وقت صرف بیروت میں کمیونسٹ عناصر کی طرف سے ۱۶ اخبارات اور رسائل نکل رہے ہیں اور شرقِ اوسط میں بائیں بازو کے کیمپ کو بھرپور غذا فراہم کر رہے ہیں۔ نشر و اشاعت کے متعدد ادارے اور فکری رہنمائی کے بے شمار مراکز ان کے علاوہ ہیں جو اسلام کے خلاف کام کر رہے ہیں۔

جون ۱۹۶۷ء کی جنگ کے بعد عرب عوام میں یہ ذہن ابھر آیا تھا کہ عربوں کی شکست کی اصل وجہ ان کی دینی اور اخلاقی کمزوری ہے۔ مراکش کے شاہ حسن ثانی نے تو صاف کہہ دیا تھا کہ ہم خدا سے دور

ہو گئے ہیں، اس لیے خدا نے بھی اپنی رحمت سے ہمیں محروم کر دیا ہے۔" کویت کے شیخ نے بھی اس شکست کو خدا کی ناراضگی سے تعبیر کیا تھا۔ اس نقطۂ نظر کا اُبھر آنا مغربی استعمار کے لیے بھی ناقابلِ قبول تھا اور اشتراکی عناصر کے لیے بھی۔ شام کے بعثی کوچہ گردوں نے بھی اِس نقطۂ نظر پر ناک بھوں چڑھائی اور عراق کے بعثی بھی اس پر بوکھلا اٹھے۔ خود اسرائیل اور اُس کے ایجنٹ بھی نہیں چاہتے کہ کامیابی اور ناکامی کو اسلام سے وابستہ کیا جائے اور پھر اس کے نتیجے میں عربوں کے اندر جہاد کا وہ جذبہ اُبل پڑے جو صلاح الدین ایوبیؒ کی رُوح کو دوبارہ زندہ کر دے، جس نے حطّین کے مقام پر آخری کامیاب جنگ لڑ کر بیت المقدس کو صلیبی طاقتوں سے آزاد کروا لیا تھا یا امیر قطز کی یاد تازہ ہو جائے جس نے عین جالوت کے معرکے میں غیر معمولی جانبازی دکھا کر مصر اور شرقِ اوسط کو تاتاری یلغار سے بچا لیا تھا۔ چنانچہ ۱۹۶۷ء کے بعد سے آج تک مسلسل یہ کوششیں کی جا رہی ہیں کہ مذہب کو مسئلۂ فلسطین سے بے تعلق رکھا جائے۔ وارفتہ مزاج، پراگندہ خیال اور ژولیدہ فکر لوگوں کا ایک گروہ برابر مذہب کی بیخ کنی اور مذہب پر طرح طرح کے حملے کرنے میں مصروف ہے۔ شام کا ایک اشتراکی ڈاکٹر صادق جلال العظم، لبنان کا عیسائی مفکر ندیم البیطار اور الجزائر کا مفرور کمیونسٹ کاتب یاسین اس گروہ کے سرخیل ہیں۔ لبنان کی سوشلسٹ صحافت اور بالخصوص روزنامہ النہار اور روزنامہ موافقف اور دار الطلیعہ پبلشنگ ہاؤس کی مطبوعات اس کی پشت پناہی کر رہے ہیں۔

صادق العظم کا مذہب پر حملہ دار الطلیعہ کی طرف سے حال ہی میں مارکس کے ایک شیدائی صادق جلال العظم کی کتاب شائع ہوئی ہے جس کا نام ہے: نقد الفکر الدینی" (مذہبی افکار پر تنقید)۔ اس کتاب میں مصنف نے آسمانی مذاہب اور خاص طور پر اسلام کی بڑے گستاخانہ انداز میں تضحیک کی ہے۔ ۲۰۳ صفحات کی اس کتاب کا ایک ایک باب اسلام کے بنیادی عقائد اور تعلیمات کے خلاف مصنف کی زہر افشانیوں اور ہرزہ سرائیوں سے بھرا ہوا ہے۔ مصنف قرآنِ کریم کی آیت وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِکَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِیْسَ، قَالَ ءَاَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طِیْنًا (اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو انہوں نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے نہ کیا اور کہنے لگا کیا میں اُسے سجدہ کروں جسے

تو نے مٹی سے پیدا کیا ہے؟ کو نقل کرتا ہے اور پھر بڑے تحکمانہ انداز کے ساتھ لکھتا ہے کہ یہ آیت بتاتی ہے کہ ابلیس نے جب سجدہ سے انکار کر دیا تو اللہ نے اُسے جنت سے جلاوطن کر دیا، اور پھر مصنف خود ہی یہ سوال اٹھا دیتا ہے کہ کیا یہ واقعہ (نعوذ باللہ) مذہبی خرافات میں سے نہیں ہے؟ اور پھر خود ہی اس کا جواب دیتے ہوئے لکھتا ہے کہ اگر اس واقعہ کو پوری طرح صحیح مان لیا جائے اور کائنات اور انسانی تاریخ کی یہی حقیقت تسلیم کر لی جائے تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اس واقعہ میں اور علمی تحقیق میں کھلا تضاد پایا جاتا ہے۔ اور اگر انسانی تاریخ اس واقعہ کے برعکس ہے تو پھر یہ واقعہ نہیں ہے بلکہ ایک حسین دیومالائی کہانی ہے۔ ایک اور عنوان کے تحت مصنف اسلام اور سائنس کا موازنہ کرتا ہے اور جنت، ملائکہ اور ابلیس وغیرہ سے متعلق قرآنی آیات نقل کر کے آخر میں یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ یہ تمام چیزیں اسی طرح کی "خرافات" (نعوذ باللہ منہا) ہیں جس طرح کی خرافات یونان کے دیوتاؤں، سمندری دلھن، چڑیلوں اور عنقا پرندہ کے متعلق مشہور ہیں۔ یہ نتیجہ نکالنے کے بعد مصنف ان بنیادی عقائد پر بار بار حملے کرتا ہے اور وہی کردار ادا کرتا ہے جو اخوان الصفا کے مصنفین نے ادا کیا ہے۔ "المیہ ابلیس" کے عنوان کے ضمن میں مصنف شیطان کے ساتھ انتہائی اظہار ہمدردی کرتا ہے۔ لکھتا ہے: "کہا جاتا ہے کہ ابلیس بڑا مقرب فرشتہ تھا، اور ملاء اعلیٰ کے اندر اُسے بڑی اونچی حیثیت حاصل تھی، مگر اُس نے جب خدا کی نافرمانی کی تو خدا نے اُسے جنت سے باہر نکال دیا اور اُس پر ابدی لعنت کی۔ اور اگر خدا ان تمام چیزوں کا بنانے والا ہے اور خیر اور شر کا پیدا کرنے والا ہے تو پھر اُس نے لوگوں سے یہ مطالبہ کیوں کیا کہ وہ ابلیس کو شر کا سرچشمہ سمجھیں۔ اور جن انسانوں کو خدا نے شر کے لیے پیدا کیا ہے اور اُن کے ہاتھوں شر جاری کیا ہے تو آخر ان لوگوں کے شر کا بوجھ ابلیس پر کیوں ڈال دیا گیا ہے"۔ یہ بیان کرنے کے بعد مصنف ہرزہ سرائی پر اُتر آتا ہے اور لکھتا ہے کہ "مکاری خدا کی ایک صفت ہے" (نعوذ باللہ منہا الف مرۃ)۔ اسی موضوع پر وہ مزید بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "اللہ نے ازل سے یہ فیصلہ کر رکھا ہے کہ کون جنتی ہے اور کون دوزخی۔ اور اس کے باوجود اللہ نے رسول بھیجے، کتابیں نازل کیں اور انہیں امر اور نہی سے بھر دیا اور حلال و حرام کی پابندیاں عائد کیں"۔ آخر میں نتیجہ یہ نکالتا ہے کہ "رسولوں کا بھیجنا، کتابوں کا نازل کرنا اور حلال اور حرام کے احکام بتانا یہ

سب کچھ خدا کی مکاری کے ہتھکنڈے ہیں (استغفر اللہ)، وہ ان ہتھکنڈوں کے ذریعہ انسانوں پر اپنی مشیت کے احکام نافذ کرنا چاہتا تھا۔" اس کے بعد مصنف مشورہ دیتا ہے کہ "ہمارا فرض ہے کہ ہم ابلیس کا وقار بحال کریں، اور اس کو حسبِ سابق فرشتہ تسلیم کریں، اور اُسے گالی گلوچ دینے سے پرہیز کریں، اُسے معاف کر دیں، اور اگر اب تک اُس پر بہتان تراشی کرتے رہے ہیں اور اُسے تمام نقائص و عیوب کا ذمہ دار گردانتے رہے ہیں تو اب لوگوں کو سمجھنا چاہیے کہ ابلیس بڑا نیک ہے۔"

شیطان کے یارِ غار اور مرید صادق ڈاکٹر صادق جلال العظم نے عیسائیت پر بھی اسی نوعیت کی تنقید کی ہے اور انتہائی شرانگیز انداز کے ساتھ خدا کا مذاق اڑایا ہے۔

مسلمانوں کا شدید ردِ عمل اس کتاب کے خلاف سب سے پہلے بیروت کے اسلام پسند جریدہ ہفت روزہ الشہاب اور اخوان المسلمون کے حلقوں نے احتجاجی آواز اٹھائی اور مسلم عوام کو اس فتنہ سے آگاہ کیا۔

لبنان کے مفتی شیخ خالد حسن جو لبنان کی سنی کونسل کے صدر بھی ہیں، کی طرف سے ایک فتویٰ صادر ہوا جس میں مصنف کو مرتد اور خارج از اسلام قرار دیا گیا۔ اور مصنف اور ناشر کو قرار واقعی سزا دینے کا مطالبہ کیا گیا۔ لبنانی حکومت نے مسلمانوں کے مسلسل احتجاج اور مطالبے کے پیشِ نظر مصنف کو مذہبی شعائر کی توہین کے الزام میں فوجداری قوانین کی دفعہ ۳۱۷ اور مطبوعات کے قانون کی دفعہ ۶۲ کے تحت ۸ جنوری ۱۹۷۰ء کو گرفتار کر لیا اور ۱۵ جنوری کو ایک ہزار لبنانی پونڈ کی ضمانت پر رہا کر دیا۔ اس کارروائی کے خلاف لبنان کے تمام مغرب پرستوں اور سوشلسٹوں اور قوم پرستوں نے سخت اودھم مچا دیا۔ ان لوگوں کی نگاہ میں حکومت کا یہ اقدام فکر و رائے کی آزادی کے خلاف ہے۔ امریکن یونیورسٹی سے لے کر تمام کمیونسٹ اور بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے اخبارات نے کئی روز تک صفِ ماتم بچھائے رکھی اور حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ ایسے تمام قوانین کو ختم کر دے جو "دقیانوسی ہوں" اور آزادیٔ اظہار پر پابندی عائد کرنے والے ہوں۔ ان لوگوں نے آزادیٔ فکر کے نام سے لبنانی دستور اور لبنانی قانون پر بڑی تند و تیز تنقیدیں کی ہیں۔

اُدھر بیروت میں مجلسِ امورِ اسلامی کے دفتر میں لبنان کی اسلامی تنظیموں نے ایک اسلامی کانفرنس

منعقد کی اور کتاب اور مصنف اور ناشر تینوں کے خلاف ضروری کارروائی کی تکمیل کا مطالبہ کیا۔ اس کے جواب میں لبنان کی سوشلسٹ پروگریسو پارٹی (الحزب التقدمی الاشتراکی) کے صدر کمال جُنبلاط جو آج کل وزیرِ داخلہ ہیں، اخوان المسلمون اور لبنان کے اسلامی محاذ پر برس پڑے اور اُن پر الزام لگایا کہ یہ لوگ ڈاکٹر صادق العظم کے مسئلہ کو ہوا دے رہے ہیں۔ مگر اس بیان میں انہوں نے یہ بھی تسلیم کیا کہ ابھی تک انہوں نے یہ کتاب نہیں پڑھی ہے۔ کمال جنبلاط کے اس بیان پر سب سے بہتر تبصرہ ماونٹ لبنان کے مفتی شیخ جوزو نے کیا ہے۔ انہوں نے اپنے بیان میں کہا ہے:

"کمال جنبلاط کا یہ انکشاف بڑا اہم ہے کہ ڈاکٹر صادق العظم کی علمی تحقیق کو سیاسی رنگ دیا جا رہا ہے، اور اس کی آڑ میں عرب قومیت کی تحریک، عرب سوشلزم اور مارکسزم اور سوویت یونین پر حملے کیے جا رہے ہیں۔ کمال جنبلاط نے یہ انکشاف بھی کیا ہے کہ اس معاندانہ تحریک کی پُشت پر امریکہ کا محکمۂ جاسوسی اور اخوان المسلمون اور بعض تیل پیدا کرنے والے ممالک کا ہاتھ کام کر رہا ہے۔ لیکن میں کمال جنبلاط کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ عوام اس حد تک بے وقوف نہیں ہیں کہ وہ آپ جیسے شخص کے الزامات پر کان دھریں جو نہ اسلام کا قائل ہے نہ عیسائیت کا اور نہ دروزی مذہب کا بلکہ اُسے بھارت کی بُت پرستی مرغوب ہے۔ کمال جنبلاط جب ۱۹۵۴ء میں امریکہ گیا تھا تو اُس نے اپنے تاثرات میں لکھا تھا کہ امریکہ کا نظام، امریکہ کی مشینی طاقت اور ڈالر کی حکمرانی کائنات کی طاقتوں کو اس قدر تصرف میں لا رہی ہے کہ توریت کے دس احکام کی جھلک سامنے آجاتی ہے، اور امریکہ کی مادی ترقی عہد نامہ جدید کی عکاس ہے۔ اور آج کل جنبلاط مارکس کو انبیاء پر فوقیت دیتا ہے۔"

کمال جُنبلاط کے بارے میں یہ جان لینا بھی ضروری ہے کہ ان کا تعلق دُروزی فرقہ سے ہے اور یہ لبنان کے سوشلسٹوں کی معروف رہنما سمجھے جاتے ہیں۔ ۱۹۶۵ء کی پاکستان و بھارت جنگ میں انہوں نے ہندوستان کے لیے امدادی فنڈ جمع کرنے میں بڑی سرگرمی دکھائی اور بیروت میں ایک کمیٹی تشکیل کی تھی جس کے یہ خود ہی صدر تھے۔ اور اب گاندھی کی صد سالہ سالگرہ کے موقع پر بیروت میں جو کمیٹی تشکیل دی گئی ہے اُس کے ایک ممبر یہ بھی

ہیں۔ اور گاندھی کی خدمات پر ایک تحقیقی مقالہ لکھ رہے ہیں۔ اسلامی کانفرنس نے کمال جنبلاط کے رویّے پر شدید غم و غصّہ کا اظہار کیا ہے اور اُن پر یہ الزام لگایا ہے کہ وہ آزادیٔ فکر کی آڑ میں فتنہ انگیزی کر رہے ہیں اور الحاد و انار کی کو رواج دے رہے ہیں۔ ایک طرف اس سوشلسٹ لیڈر کا یہ حال ہے کہ جس کتاب میں آسمانی مذاہب اور اسلامی تعلیمات کی کھلم کھلا دھجیاں اڑائی گئی ہیں اور جس نے لبنان کے مذہبی حلقوں میں اضطراب و قلق کا طوفان مچا دیا ہے اُس سے تو آزادیٔ فکر کے نام پر اغماض برتتے ہیں۔ اور دوسری طرف ان کی زُنّاری کا یہ حال ہے کہ بیروت کا ایک ہفت روزہ "الجدید" شام کے بعض رہنماؤں پر ایک تنقیدی مضمون چھاپتا ہے اور دلائل سے یہ ثابت کرتا ہے کہ ان رہنماؤں نے جون ۶۷ء کی جنگ میں نہایت افسوسناک رویہ اختیار کیا اور جولان کی پہاڑیاں دانستہ اسرائیل کے حوالے کر دیں، تو اس پر کمال جنبلاط صاحب نہ صرف یہ کہ الجدید کو چند روز کے لیے بند کر دیتے ہیں بلکہ خود شام پہنچ کر بعض رہنماؤں سے معافی مانگتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں سوشلسٹ لیڈر کی نگاہ میں خدا اور انبیاء کی توہین کوئی اہمیت نہیں رکھتی، البتہ ایک شکست خوردہ جنرل احمد سویدانی (جولان کی پہاڑیوں کے محاذ پر شامی فوجوں کے قائد) کی ذات اس قدر محترم ہے کہ اس پر کسی کو تنقید کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔

بہرحال لبنان کے اسلام پسند حلقے اور مذہب پرست مسلمان ستائش و تحسین کے مستحق ہیں کہ ان کے بھرپور احتجاج کے نتیجے میں مصنف کی گرفتاری عمل میں آگئی اور اس کے خلاف بیروت کی تحقیقاتی عدالت میں مقدمہ دائر ہوگیا۔ اس عدالت کی طرف سے مصنف پر فردِ جرم بھی عائد کر دی گئی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ چونکہ مصنف نے اسلام پر بھی حملے کیے ہیں، عیسائیت کو بھی رگیدا ہے اور ملکی قانون کی خلاف ورزی بھی کی ہے، اور فرقہ پرستی کے نعرے کو بھی ہوا دینے کی کوشش کی ہے لہٰذا اسے ایک سال سے لے کر ۳ سال تک قید کی سزا اور ۵۰ سے لے کر ۲۰۰ تک شامی پاؤنڈ جرمانہ کی سزا دی جانی چاہیے۔ کتاب کے ناشر کو اس جرم میں برابر کا حصہ دار قرار دیا ہے۔ بیروت کے روزنامہ الحیاۃ نے لکھا ہے کہ ڈاکٹر صادق العظم دماغی مریض ہے۔ اور اسے تصرفاتِ ناروا کی بنا پر متعدد یونیورسٹیوں سے خارج کیا جاچکا ہے۔ مگر حیرت ہے کہ ایسا دماغی مریض بھی اگر ایک بے سروپا کتاب لکھ دیتا ہے تو عربوں کے سوشلسٹ حلقے اُسے ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں

اور اُس کے دفاع پر ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے ہیں۔

لبنان میں مغربی طاقتوں کی دراندازی کوئی ڈھکی چھپی چیز نہیں ہے۔ وہاں کے مسلمانوں کی اکثریت بھی مغربی تہذیب سے بُری طرح متاثر ہے۔ مگر یہ بات بحد قابلِ تحسین ہے کہ ایک گمراہانہ کتاب کے خلاف جب مسلمانوں نے واویلا کیا ہے تو حکومت کی طرف سے اس کا نوٹس لیا گیا ہے اور مصنف کے لیے سزا تجویز کی گئی ہے

الجزائری کمیونسٹ کی تجاویز: صادق العظم کے دو اور سرگرم ساتھیوں کا اوپر تذکرہ ہو چکا ہے۔ ان میں سے ایک کاتب یاسین ہے۔ یہ الجزائر کا رہنے والا ہے۔ مگر الجزائر کو ترک کر کے اب شرقِ اوسط کے سوشلسٹ حلقوں میں کام کر رہا ہے۔ الجزائر کو ترک کرنے کی وجہ اُس نے یہ بیان کی ہیں کہ "الجزائر کے انقلاب نے مذہب کی پوری طرح بیخ کنی نہیں کی ہے بلکہ مذہب کے ساتھ کسی حد تک مصالحت کر رکھی ہے" (الجدید، بیروت۔ ۱۹ دسمبر ۱۹۶۹ء)۔ اس نے حال ہی میں بیروت کے روزنامہ النہار (شمارہ ۳ اکتوبر ۱۹۶۹ء) میں "آزادیٔ وطن" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا ہے۔ اس کی نگاہ میں آزادیٔ وطن کا مفہوم یہ ہے:

"اُس وقت تک وطن کی آزادی کوئی حیثیت نہیں رکھتی جب تک رجعت پسند عناصر اور مذہبی خیالات کی اچھی طرح بیخ کنی نہ کر دی جائے۔ چنانچہ ہمیں یعنی اشتراکیت کے علمبرداروں کو مذہب کے خلاف فیصلہ کن کشمکش برپا کرنی چاہیے۔ ہر وہ انقلاب جو مذاہب و ادیان کا خاتمہ نہیں کرتا وہ اپنے مزاج سے غداری کرتا ہے یعنی وہ اصل وطن پرستانہ انقلاب نہیں ہے۔"

روزنامہ النہار کے ۷ دسمبر ۱۹۶۹ء کے شمارے سے کاتب یٰسین نے قرآن کریم اور آسمانی تعلیمات کے خلاف ایک سلسلۂ مضامین شروع کر رکھا ہے۔ اس کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ عوام الناس کی توجہات کو اصل مسئلہ سے ہٹا کر اس طرح کے مسائل میں اُلجھا دیا جائے اور قوم کی فکری اور مادی طاقتوں کو یہودیوں کے خلاف صرف کرنے کے بجائے داخلی جنگ میں جھونک دیا جائے۔

عربوں کی شکست پر ایک سوشلسٹ لیڈر کا تبصرہ لبنانی سکالر ندیم البیطار جو اس وقت سوشلسٹ عربوں کا عقلِ مفکر" بنا ہوا ہے، اُس کی کتاب "من النکسۃ الی الثورۃ" کو ترقی پسند حلقے وسیع پیمانے پر پھیلا رہے ہیں۔ ندیم البیطار نے اسرائیل کی کامیابی اور عربوں کی شکست پر (جسے وہ شکست نہیں بلکہ "پسپائی" سے تعبیر کرتا ہے)، جو تبصرہ کیا ہے اس کے چیدہ چیدہ حصے ملاحظہ ہوں:

"عربوں کو سمجھ لینا چاہیے کہ انہیں دو باتوں میں سے ایک بات اختیار کرنی ہو گی۔ انہیں عربوں کی روایت پرستی کا خاتمہ کرنا ہو گا یا پھر صہیونی سامراج کو باقی رکھنا ہو گا۔ وہ جان لیں کہ پہلی چیز یعنی روایت پرستی کا خاتمہ دوسری چیز یعنی صہیونی سامراج کے خاتمہ کی بنیادی شرط ہے" (ص ۱۴۸)

"روایت پرستی" سے ندیم البیطار کی مراد عربوں کی مذہب پرستی، مذہبی تعلیمات اور اسلامی تاریخ ہے۔ گویا ندیم البیطار کی نظر میں اسرائیل کا وجود صرف اس بنا پر قائم ہے کہ عربوں کے اندر مذہب کے ساتھ وابستگی پائی جاتی ہے جس روز عرب مذہب سے ہاتھ اٹھا لیں گے صہیونیت مٹ جائے گی۔ ندیم البیطار اپنے مذکورہ بالا مشورے کا ثبوت یہ پیش کرتا ہے کہ:

"عرب قوم نے سامراج کے خلاف جتنی کامیابیاں حاصل کی ہیں اور جتنی تہذیبی تبدیلیاں برپا کی ہیں وہ سب عرب قومیت کی برکت سے کی ہیں۔ مذہب کے طفیل نہیں کیں۔ بلکہ عربوں نے دین کے نام سے جتنی جنگیں لڑی ہیں وہ ناکام ہوئی ہیں" (ص ۱۹۳)

یعنی بدر، احد، خندق اور مکہ کے غزوات، قادسیہ کی جنگ، افریقہ کی فتوحات، اندلس کی فتح، حطین کی جنگ، ان سب موقعوں پر ندیم البیطار کی رائے میں عربوں نے شکست کھائی ہے۔ البتہ ترکوں کے مقابلے میں عرب قوم پرستوں کی انقلابی تحریکیں کامیاب رہی ہیں کیونکہ ان تحریکوں کے نتیجے میں عرب قوم پرستوں نے شام اور لبنان فرانس کو دے دیا تھا، اور عراق، اردن اور فلسطین انگریزوں کے حوالے کر دیا تھا۔ ۱۹۵۶ء کی جنگ سویز اور پھر ۱۹۶۷ء کی جنگ میں بھی عرب قومیت نے فتح کا پھریرا لہرایا ہے! ایک اور جگہ ندیم البیطار عرب نوجوانوں کو بتاتا ہے کہ

"وہ تمام سیاسی تحریکیں جو مذہب کے نام پر برپا ہوئی ہیں، قدامت پسندانہ تحریکیں تھیں۔

ان کا اصل نصب العین یہ تھا کہ عربوں کے اندر کوئی تہذیبی تبدیلی رونما نہ ہو۔ وہابیوں کی تحریک ہو یا سنوسیوں کی جماعت، ادریسی درویش ہوں یا اخوان المسلمون کے لوگ، یہ تمام رجعت پسند تھے۔ ان تحریکوں نے ترکوں کی مخالفت کی، مگر حریت اور آزادی کے ساتھ محبت کی وجہ سے نہیں بلکہ صرف اس بنا پر کہ ان تحریکوں کے خیال میں عثمانی ترک دین سے منحرف ہو گئے تھے اور انہوں نے مغرب کے طور طریقوں کو اختیار کرنا شروع کر دیا تھا" (ص ۱۹۲)

ندیم البیطار اسرائیل کے خلاف جنگ لڑنے اور تمام عسکری قوت کو یہودیوں کے توسیع پسندانہ عزائم کے خلاف مجتمع کرنے کے بجائے عربوں کو یہ مشورہ دیتا ہے کہ پہلے رجعت پسندانہ ممالک کی سرکوبی کی جائے۔ اس کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

"معاملہ جون ۱۹۶۷ء کی جنگ کے بعد بھی جوں کا توں ہے۔ ہماری نظر میں یہ نہایت ضروری ہے کہ ہم سعودی عرب میں، خلیج عربی کی ریاستوں میں، لیبیا اور تونس و مراکش میں پائے جانے والے استعمار کا مقابلہ کریں۔ مگر ۱۹۶۷ء کی پسپائی کے باوجود عربوں کی انقلابی تحریک کو وہ طاقت اور تنظیم حاصل نہیں ہوتی جو مذکورہ بالا ممالک میں سامراج کے خلاف مزاحمت کو جاری رکھ سکے۔ حالانکہ مقبوضہ فلسطین کو آزاد کرانے کے لیے ہم جو جنگ لڑ رہے ہیں اس کا یہ جز نہایت اہم ہے کہ ہم ان سامراج پرست عرب ملکوں کے خلاف مزاحمت کی تحریک جاری رکھیں" (ص ۶۵)

یہ سوشلسٹ فلاسفر ایک طرف عرب اسرائیل جنگ کو ایک نئی شکل میں ڈھالنا چاہتا ہے اور عربوں کی فوجوں اور اسلحہ کا رخ اسرائیل کے بجائے خود عربوں کی طرف ہی موڑ دینا چاہتا ہے۔ دوسری طرف وہ اسرائیل کے خلاف عربوں کے اندر جہاد کی تحریک کی سخت مخالفت کرتا ہے:

"ہماری انقلابی تحریک کا سب سے زیادہ افسوس ناک پہلو وہ اپیلیں ہیں جن میں "جہاد" کی دعوت دی جا رہی ہے اور جہاد کا سہارا لیا جا رہا ہے۔ یہ اپیلیں بعض انقلابی ممالک کے دارالحکومتوں سے بھی صادر ہو رہی ہیں۔ بہر حال جس انجام کی وہ مستحق تھیں اس کو پہنچ گئی ہیں۔" (ص ۱۵۶)

جنگ کے بعد جامعہ ازہر کے بعض علماء کی طرف سے جہاد کے لیے جو اپیل کی گئی تھی ندیم البیطار اُس پر چین بجبیں ہے ۔ جس طرح صلیبی عناصر کو سب سے زیادہ اگر کسی لفظ سے چڑ ہے تو وہ لفظ جہاد ہے ، اسی طرح عربوں کے ترقی پسند حلقے بھی اس لفظ کا اعادہ گوارا نہیں کرتے ۔

مذہبی عقائد پر حملہ | امورِ غیبیہ یعنی خدا کے وجود، رسالت، آخرت، ملائکہ اور جنت و دوزخ پر ایمان کو ندیم البیطار پسماندگی کا دوسرا نام قرار دیتا ہے اور ترقی کے لیے کفر و الحاد کی دعوت پیش کرتا ہے ۔ ترقی اور پسماندگی کے بارے میں اُس کا تجزیہ ملاحظہ ہو :

"ایتھوپیا سے لے کر سعودی عرب اور تھائی لینڈ تک وہ ممالک ہیں جو پسماندہ ترین ممالک کہے جا سکتے ہیں ۔ کیونکہ یہ ممالک ابھی تک غیبی عقائد پر مبنی نظریات کو ریاست اور معاشرے کی بنیاد قرار دیتے ہیں ۔ مگر روس، چین اور کیوبا کو دیکھیے کہ وہ طاقتور اور برتر ممالک کی فہرست میں شامل ہیں، کیونکہ انہوں نے ان نظریات کو مسترد کر دیا ہے ۔ مغربی یورپ کے نقشہ میں بھی ہمیں یہی تقسیم ملتی ہے ۔ مغربی یورپ کے وہ ممالک موجودہ تہذیبی قافلے سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں جو ابھی تک غیبی آئیڈیالوجی کو چمٹے ہوئے ہیں ۔ اور روایت پرستی میں مبتلا ہیں ۔ مثلاً اسپین اور پرتگال ۔ امریکہ کے نقشے میں بھی اسی اصول کی کارفرمائی نظر آتی ہے ۔ امریکہ کا پسماندہ حصہ لاطینی امریکہ ہے ۔ کیوں ؟ اس لیے کہ اُس نے غیبی آئیڈیالوجی کا چولا پہن رکھا ہے" (ص ۱۹۳)

عراق کے مشہور فوجی مصنف جنرل محمود شیت خطاب نے اپنی ایک کتاب میں یہ بیان کیا ہے کہ حضرت سلمہ بن اکوعؓ کا طریقۂ جنگ موجودہ گوریلا جنگ سے بہت ملتا جلتا تھا ۔ ندیم البیطار اس مثال کا مذاق اڑاتا ہے اور اسے "بچکانہ ذہن" کی پیداوار قرار دیتا ہے ۔ اس کے مقابلے میں وہ چی گوئیوارا کو نمونے کے طور پر پیش کرتا ہے ۔ لبنان کے ایک دینی رہنما کے اس خیال کا بھی اُس نے مذاق اڑایا ہے کہ جو فرشتے غزوۂ خندق میں مسلمانوں کی مدد کے لیے اُترے تھے وہ آج بھی ہماری مدد کے لیے نازل ہو سکتے ہیں ۔ ندیم البیطار اور اُس کے ہم مشرب افراد عربوں کو تو یہ سبق دیتے ہیں کہ تمہاری پسماندگی اور کمزوری کا موجب دین ہے ، لہٰذا تم دین کو فارغ خطی دے دو ۔ مگر جب انہیں یہ بتایا جاتا ہے کہ خود اسرائیل بھی تو دین کو دانتوں سے

پکڑے ہوتے ہے اور دن رات یہودی عوام کے اندر مذہبی تعلیمات کا پرچار کر رہا ہے لیکن باین ہمہ تم خود اُسے پسماندہ نہیں مانتے ہو بلکہ اُس کی ترقی کی داستانیں سناتے ہو اس کی کیا وجہ ہے؟ تو اس سوال کے سامنے اُن کا وہی حال ہو جاتا ہے جسے قرآن کریم "فبھت الذی کفر" کے لفظوں سے تعبیر کرتا ہے۔

"ہر معاملہ میں مذہب کو نہ گھسیٹا جائے" جنرل محمود شیت خطاب عراق کے نامور اسلامی مصنف ہیں۔ اسلامی فتوحات پر عسکری نقطۂ نگاہ سے انہوں نے متعدد ضخیم کتابیں رقم کی ہیں۔ جنگِ فلسطین پر بھی وہ اہم کتابیں لکھ چکے ہیں۔ وہ برابر اس امر پر اصرار کر رہے ہیں کہ اسرائیل کو ختم کرنے کے لیے عرب حکومتوں کو جہادِ اسلامی کا اعلان کرنا چاہیے اور نوجوانوں کے اندر اسلامی روح کو بیدار کرنا چاہیے ۱۹۴۸ء میں وہ خود بھی جنگِ فلسطین میں قائد کی حیثیت سے حصہ لے چکے ہیں۔ موصوف نے ماہنامہ الوعی الاسلامی (کویت) کے دسمبر ۱۹۶۹ء کے شمارے میں لکھا ہے:

> "کل میرے پاس ایک صاحب آئے جو ایک بہت بڑے عرب ریڈیو اسٹیشن میں معروف اناؤنسر ہیں اور مجھ سے کہنے لگے کہ ایک نامی گرامی عرب مصنف نے آپ کے بارے میں کہا ہے کہ آپ اپنے ہر مضمون کو مذہب کا رنگ دے دیتے ہیں۔ اتفاق کی بات ہے کہ اسی روز فلسطینی فدائین کے ایک قائد بھی مجھ سے ملنے آئے، اور مجھے دو ٹوک لفظوں میں کہنے لگے: "آپ اپنی ہر تحریر میں مذہبی پہلو کو کیوں گھسیٹ لاتے ہیں"۔ اس معروف اناؤنسر نے جو قول نقل کیا ہے اور فلسطینی قائد نے جو تنقید کی ہے اُس کا صاف مطلب یہ ہے کہ فوجی قائد کو مذہب پرست نہیں ہونا چاہیے"

محمود شیت خطاب اِن ابتدائی کلمات کے بعد لکھتے ہیں: "اس فلسطینی بھائی کے ساتھ میری گہری دوستی تھی۔ اس لیے کہ وہ اس فلسطین کا باشندہ ہے جس کی محبت میرے رگ و ریشے میں سمائی ہوئی ہے، اور ایک فاضل مفکر اور دانشور ہے۔ مگر اس کے بعد میں نے ہمیشہ کے لیے اس سے

دوستانہ روابط ختم کردیئے۔ کیونکہ وہ اس وہم میں مبتلا ہے کہ دین پسماندگی کی علامت ہے اور عرب جب تک دین سے جان نہیں چھڑا لیتے کامیاب نہیں ہوسکتے۔ میرا یہ قدیم فلسطینی دوست اُس عرب ملک میں رہ رہا ہے جس کی اکثریت دین سے وابستہ ہے۔ چنانچہ اُس کا بھی خیال تھا کہ اس عرب ملک کی پسماندگی کا راز بھی وہاں کے عوام کی دینداری ہے۔ مگر اُسی دوست نے مجھے یہ "بشارت" بھی دی کہ یہ ملک اب جہالت اور بوسیدہ روایات سے آزادی حاصل کرنے کی طرف مائل ہو رہا ہے۔ اس کا ثبوت انہوں نے یہ دیا کہ وہاں یونیورسٹی کے طلبہ نے اب شراب نوشی شروع کردی ہے۔"

مطبوعات

اسلام، ایک نظریہ، ایک تحریک تالیف: محترمہ مریم جمیلہ صاحبہ۔ مترجم: جناب آباد شاہ پوری ایم اے
شائع کردہ: مکتبہ یوسفیہ سنت نگر، لاہور۔ صفحات ۴۰۰۔ قیمت اعلیٰ ایڈیشن ۱۰ روپے۔
سستا ایڈیشن ۷ روپے۔

زیر تبصرہ کتاب نومسلم خاتون محترمہ مریم جمیلہ کی ایک قابلِ قدر انگریزی تصنیف ISLAM IN THERY AND PRACTICE (جس کا تعارف ترجمان القرآن میں پہلے کرایا جا چکا ہے) کا اردو ترجمہ ہے۔ کتاب چار حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں مصنفہ نے اپنے فکری اور اعتقادی سفر کی داستان بڑے دلچسپ پیرائے میں بیان کی ہے۔ دوسرے حصے میں انہوں نے اسلام کے نظریاتی پہلوؤں کی وضاحت کی ہے۔ تیسرے حصے میں دنیائے اسلام کے اندر اٹھنے والی اُن تحریکات کا جائزہ لیا ہے جو اٹھارھویں صدی سے اب تک احیائے دین کے لیے کوشاں رہی ہیں۔ آخری حصے میں مسلمانوں کو اُن کی دینی ذمہ داریوں کا احساس دلایا گیا ہے۔ کتاب کے ایک ایک حرف سے مریم جمیلہ کی اسلام سے گہری محبت اور وابستگی، ایمان کی پختگی اور اصابت رائے کا اظہار ہوتا ہے۔

فاضل مترجم نے اس کتاب کو بڑی خوبی کے ساتھ اردو کے قالب میں ڈھالا ہے اور الفاظ کے ترجمے کے ساتھ ساتھ مصنفہ کے پاکیزہ جذبات کو بھی بڑی کامیابی کے ساتھ اردو میں منتقل کیا ہے۔ یہ کتاب ہمارے دینی ادب میں اچھا اضافہ ہے۔

کتابت اور طباعت کا معیار عمدہ ہے۔

پاکستان میں سوشلزم اور اس کے اثرات تالیف: محمد نواز ایم۔اے۔ شائع کردہ: فرینڈز پبلیکیشنز حسین آگاہی ملتان۔ صفحات ۸۸۔ قیمت ۸۰ پیسے۔

زیرِ تبصرہ کتابچہ مختصر ہونے کے باوجود بڑا جامع اور پُراز معلومات ہے۔ اگر کوئی شخص پاکستان میں اشتراکی ریشہ دوانیوں کو سمجھنے کا خواہشمند ہو تو وہ اس ایک رسالے کے مطالعہ سے انہیں بخوبی سمجھ سکتا ہے۔ اس رسالے کی زیادہ سے زیادہ اشاعت کی ضرورت ہے۔

چینی آمریت تالیف وانگ منگ۔ شائع کردہ: فرینڈز پبلیکیشنز ملتان۔ صفحات ۴۰۔ قیمت ۴۰ پیسے۔

یہ مختصر سا کتابچہ کسی اشتراکیت کے دشمن کی تصنیف نہیں بلکہ اُس شخص کی تصنیف ہے جو سالہا سال تک چینی کمیونسٹ پارٹی کا ایک نہایت قابلِ اعتماد کارکن ہونے کی حیثیت سے کئی اونچے عہدوں پر فائز رہا۔ ماؤ نے چین میں ثقافتی انقلاب کے پردے میں جس طرح عوام پر اپنی گرفت مضبوط کی اور اختلاف رکھنے والوں پر عرصۂ حیات تنگ کیا یہ اس کی المناک بلکہ وحشت ناک سرگزشت ہے۔ اس کے پڑھنے سے اشتراکیت کے آمرانہ مزاج کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے
